درسیۂ عثمانیہ



اُردو کی چھٹی

مرتّبۂ اُردو کمیٹی

منظورۂ مجلسِ نصاب تعلیمِ ثانوی سرکارِ عالی

مُرتّبہ

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی

درسیّۂ عُثمانیہ

اُردو کی چھٹی

مرمّمۂ اُردو کمیٹی

منظورۂ مجلسِ نصابِ تعلیمِ ثانوی سرکارِ عالی

مرتّبۂ

انجمن ترقّیٔ اُردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۳۵۴ ف
۱۹۴۷ء

چھٹا ایڈیشن
قیمت ۱۰/ (دس آنے)

فہرستِ مضامین

ادب



(۱)

سُنو غور سے قوم کے نونہالو
نصیحت جو کرتا ہوں میں آج تم کو
بہت جی لگاکر پڑھو اور لکھو
مگر میری یہ بات ہرگز نہ بھولو
جو محفل میں بیٹھو تو بیٹھو ادب سے
کسی سے جو باتیں کرو تو ادب سے

(۲)

ادب ماں کا اور باپ کا فرض جانو
کرو اُن کی خدمت کہا ان کا مانو
کبھی ان سے تکرار کی تم نہ ٹھانو
مرے پیارے بچّو مرے نوجوانو
یہ فرما گئے مصطفٰے حق کے پیارے
کہ فردوس ہے ماں کے قدموں کے نیچے

(۳)

بڑوں کا ادب تم کرو جان و دِل سے
اگر وہ ہوں اونچی جگہ، بیٹھو نیچے
وہ فرمائیں جو کچھ سُنو چُپکے چُپکے
کبھی ان سے باتیں بناؤ نہ بڑھ کے
ادب ہی سے پوچھو جو کچھ پوچھنا ہو
کسی حال میں بھی نہ چھوڑو ادب کو

۴

ادب کیا ہے؟ اک تاج لطفِ خدا کا
اسے سر پہ رکھو چلے جاؤ برجا
ادب کیا ہے؟ دِل موہ لینے کا آلا
ادب کرنے والے کو سمجھیں سب اچھا

ادب ہی سے پاتا ہے انسان عزّت
وہ مخدوم ہوگا کرے گا جو خدمت

(۵)

ادب جو کرے اُس سے راضی خُدا ہے
جو گُستاخ ہے اُس سے اللہ خفا ہے
مُؤدّب کا دونوں جہاں میں بھلا ہے
ادب سے جو خالی، بُرا ہے بُرا ہے
نصیبہ ادب کرنے والے کا اونچا
جو ہے بے ادب وہ ہے قسمت کا ہیٹا

سوالات

۱- بزرگوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے؟
۲- ادب کے فایدے بیان کرو۔
۳- تمھیں جو اشعار پسند ہیں اُن کو پڑھو۔
۴- معنے بتاؤ:- مُؤدّب، فردوس- بڑھ کے باتیں بنانا- نونہال- ہیٹا-
۵- چوتھے بند کا مطلب بیان کرو-
۶- "اونچی جگہ" میں اونچی کونسی صفت ہے؟

علم حاصل کرنے میں غیروں کی جدوجہد

ہندستان اور امریکہ میں کیا فرق ہے؟ یہاں دن ہے تو وہاں رات ہے اور وہاں دن ہے تو یہاں رات ہے۔ جن دنوں ہندستان کا ستارہ عروج پر تھا امریکہ کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ آج امریکہ عروج پر ہے تو ہندستان کی پوچھ نہیں۔ ہندستان میں بازار وغیرہ میں بائیں رخ چلتے ہیں وہاں داہیں رخ۔ پوجا اور تعظیم کے وقت یہاں جوتا اتارتے ہیں، وہاں ٹوپی۔ یہاں گھروں میں راج مردوں کا ہے، وہاں عورتوں کا۔ اس ملک میں یہ شکایت ہے کہ کثرت سے بیوائیں ہیں، اس ملک میں کنواری عورتیں زیادہ ہیں۔ اس ملک میں گدھا اور الو بے وقوفی کی علامت ہیں، اس ملک میں گدھا اور الو نیکی اور عقلمندی کی نشانی ہیں۔ اس ملک میں جو کتاب لکھی جاتی ہے اگر نصف کے قریب پچھلے بزرگوں کے حوالوں سے نہ بھری ہو تو اس کی قدر نہیں، اس ملک میں کتاب کی کل باتیں نئی نہ ہوں تو اس کی قدر نہیں۔ یہاں کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے تو اسے چھپا کر رکھتے ہیں، وہاں مطبع میں مشتہر کر دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں اس بات میں بڑائی ہے کہ اوروں سے

نہ ملیں، اپنے ہی ہاتھ سے پکا کر کھائیں، سب سے الگ رہیں، وہاں جتنا اوروں سے ملیں اُتنی ہی قدر ہے۔ یہاں غیر مُلکوں کی زبان پڑھنا کچھ معیوب سا مانا جاتا ہے، وہاں جس قدر غیر مُلکوں کی زبان سے واقفیت حاصل کرو اُتنی ہی زیادہ عزت ہوتی ہے۔

جب رام جاپان کو جا رہا تھا تو جہاز پر امریکہ کا ایک عُمر رسیدہ پروفیسر دوست بن گیا۔ وہ رُوسی پڑھتا تھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ گیارہ زبانیں پہلے سے جانتا ہے۔ اُس سے پوچھا کہ اِس عُمر میں یہ نئی زبان کیوں سیکھتے ہو؟ جواب دیا کہ میں جیالوجی (علمِ طبقات الارض) کا پروفیسر ہوں رُوسی زبان میں جیالوجی پر ایک نادر کتاب لکھی گئی ہے اگر اُس کا ترجمہ کرسکوں گا تو میرے اہلِ مُلک کو فائدہ کثیر پہنچے گا اِس لیے رُوسی زبان پڑھتا ہوں۔ رام نے کہا کہ اب تم موت کے قریب ہو، اب کیا پڑھتے ہو، اب خُدا کی عبادت کرو، اس میں کیا دھرا ہے؟ جواب دیا کہ بندوں کی خدمت خُدا کی خدمت ہے۔ نیز اگر یہ کام کرتے دوزخ میں جاؤں، کچھ پروا نہیں، اگر مجھے جہنّم کے دُکھ ملتے ہیں تو ہزار جان سے قبول ہیں۔ بشرطیکہ بھائیوں کو سُکھ مل جائے۔ لارڈ میکالے کی دُعا تھی کہ مروں تو کُتب خانے میں مروں۔

مریں تو فرض ادا کرتے مریں، مُسلح مریں، میدانِ کارزار میں، ہمّت اور آنند کے ساتھ جان دیں۔ ایک شخص باغ لگاتا تھا کسی نے پوچھا بڈھے میاں کیا کرتے ہو، کیا تم اِس کا پھل کھاؤ گے؟ تُم تو قبر میں پانو لٹکائے بیٹھے ہو۔ باغبان نے جواب دیا "اوروں نے بویا تھا ہم نے کھایا، ہم بوئیں گے تو اور کھائیں گے" اِسی طرح دنیا کا کام چلتا ہے، جتنے بُزرگ گذرے ہیں کیا اِن حضرات نے اُن درختوں کا پھل خود کھایا تھا جو وہ بو گئے؟ ہرگز نہیں۔

جس وقت رام جاپان سے امریکہ کو جاتا تھا جہاز میں کوئی ڈیڑھ سَو لڑکے جاپانی تھے جن میں بعض امیر گھرانوں کے بھی تھے مگر ان میں شاید ہی کوئی ایسا تھا جو اپنے گھر سے رُپیہ لے کر چلا ہو، اکثر تو ایسے تھے کہ جہاز کا کرایہ بھی اُنھوں نے گھر سے ادا نہ کیا تھا۔ کوئی اِن میں سے امیر مُسافروں کے بوٹ صاف کرنے پر، کوئی جہاز کی چھت وغیرہ دھونے پر نوکر ہوگیا تھا اور یوں جہاز کا خرچ ادا کر رہے تھے۔ دریافت کرنے سے ان کا یہ خیال پایا گیا کہ اپنی قوم کا رُپیہ غیر مُلکوں میں جاکر کیوں خرچ کریں، جہاز کا کرایہ بھی محنت کے ذریعے سے ادا کرتے ہیں۔ امریکہ میں جاکر اِن میں بعض لڑکے تو امیروں کے گھروں میں دِن کو محنت مزدوری،

کرتے تھے اور رات کو تعلیم پاتے تھے اور بعض ریل کی
سڑک پر یا بازاروں میں روڑے کوٹنے پر یا کسی اور کام
پر لگ گئے۔ یہ لوگ گرمیوں میں مزدوری کرتے تھے اور
جاڑوں میں کالج کی تعلیم پاتے تھے۔

اسی طرح سات آٹھ سال بسر اوقات کرکے اپنے
دِماغ کو امریکہ کے عِلم و ہُنر سے اور اپنی جیبوں کو امریکہ
کے رُپے سے بھرکر یہ جاپانی اپنے مُلک میں واپس آتے ہیں۔
ہر جہاز میں بیسیوں اور کئی دفعہ سینکڑوں جاپانی امریکہ وغیرہ
کو جاتے رہتے ہیں۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں جاپانی ہر سال
جرمنی اور امریکہ جاکر وہاں سے عِلم حاصل کرکے واپس
آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ پچاس سال
ہوئے جاپان ہِندُستان سے بھی پست تھا، آج یورپ کی
ٹکّر کا ہے۔

سوالات

۱۔ مُسلح ، میدانِ کارزار ، روڑا ، عروج ، معیوب ، گور اور بسر
اوقات کرنا کے معنے بتاؤ۔

۲۔ مطلب بتاؤ۔ یہاں کارآمد بات چھپاکر رکھتے ہیں، وہ مطلع ہیں

مشتہر کرتے ہیں۔

۳۔ ہندستان اور امریکہ میں کیا فرق بتایا گیا ہے؟

۴۔ امریکہ کا بڈھا پروفیسر روسی زبان کیوں پڑھ رہا تھا؟

۵۔ پروفیسر کا خدا کی عبادت کے بارے میں کیا خیال تھا؟

۶۔ بڈھے مالی نے کیا بات کہی، بیان کرو۔

۷۔ جاپان کی ترقی کے کیا اسباب بیان کیے گئے ہیں۔

۸۔ نیچے لکھے ہوئے جملوں میں سے صفتیں تلاش کرو اور اُن کے اقسام بتاؤ۔

(۱) وہ گیارہ زبانیں پہلے ہی سے جانتا ہے۔

(۲) روسی زبان میں جیالوجی پر ایک نادر کتاب لکھی گئی ہے۔

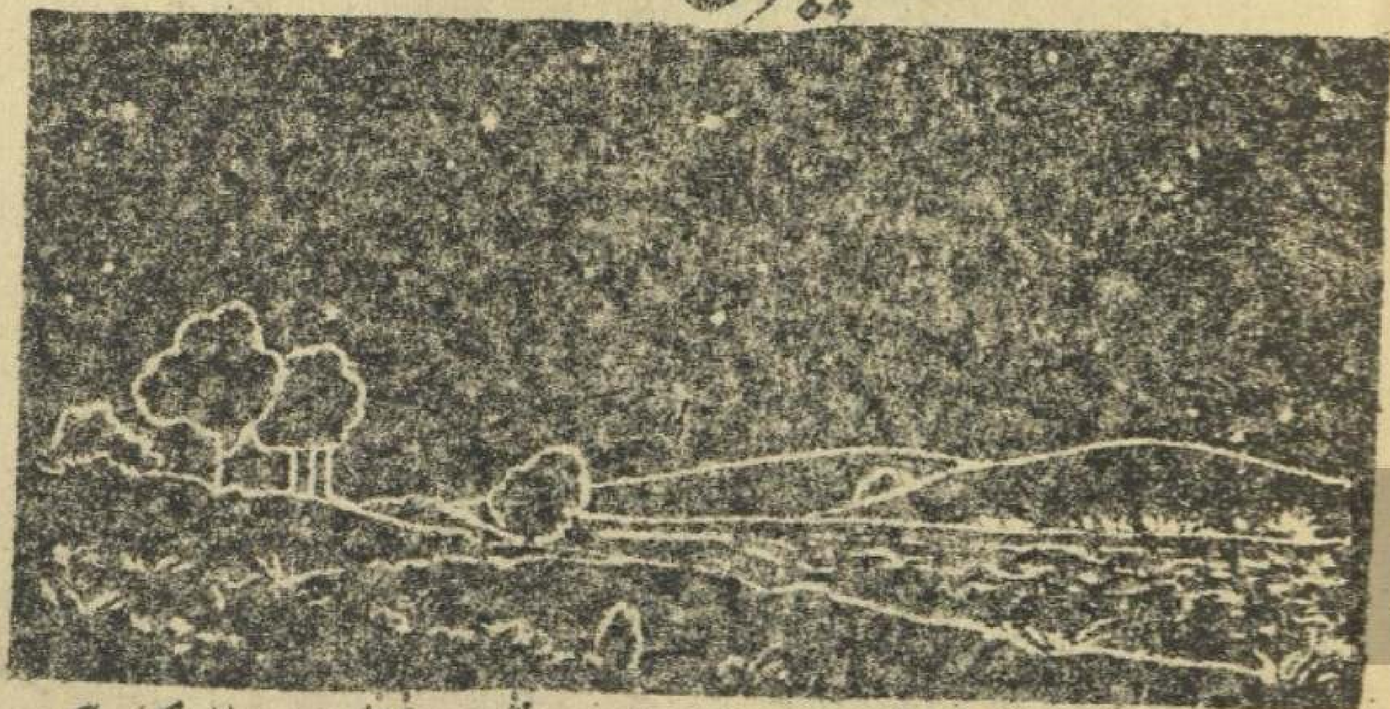
(۳) اِس ملک میں یہ عام شکایت ہے۔

(۴) یہاں غیر ملکوں کی زبان پڑھنا کچھ معیوب سا مانا جاتا ہے وہاں جس قدر غیر ملکوں کی زبان سے واقفیت حاصل کرو اُتنی ہی زیادہ عزت ہوتی ہے۔

(۵) ان میں سے بعض لڑکے امیروں کے گھروں میں محنت مزدوری کرتے تھے۔

(۶) ہر جہاز میں بیسیوں اور کئی دفعہ سیکڑوں جاپانی امریکہ کو جاتے ہیں۔

اندھیری رات



ہر سمت اندھیری چھائی ہے
ہر شے پر غفلت طاری ہے

سب اپنے گھروں میں سوتے ہیں
نیند اپنی سب کو پیاری ہے

ہاں میری قسمت میں شاید
بے خوابی ہے بیداری ہے

ڈوبا ہوں غم کے سمندر میں
اور آنکھ سے ندی جاری ہے

جس سمت نگاہیں اٹھتی ہیں
اندھیاری ہی اندھیاری ہے

اے ننھے تارو جاؤ
تم کیوں دیر لگاتے ہو

اب چاند ہے سوتا مغرب میں
ہاں تم بھی کیوں نہیں جاتے ہو

کیوں دور سے مجھ کو تکتے ہو　　کیوں آنکھیں مجھ کو دِکھاتے ہو
اچھا آجاؤ پاس مرے　　ہاں آؤ کیوں نہیں آتے ہو
جس سمت نگاہیں اُٹھتی ہیں
اندھیاری ہی اندھیاری ہے

اے باغ کے سونے والے پھولو　　آنکھیں اپنی کھولو تم
بس اُٹھو کتنا سوؤ گے　　اب شبنم سے مُنہ دھولو تم
میں دِل بہلانے آیا ہوں　　اے غنچو مُنہ سے بولو تم
کچھ لے نہ اُڑی ہو بادِ صبا　　اب جیبیں اپنی ٹٹولو تم
جس سمت نگاہیں اُٹھتی ہیں
اندھیاری ہی اندھیاری ہے

اے پیارے چمکیلے جگنو　　کیوں دل میں آگ لگاتا ہے
تاریک فضا میں چنگاری　　کیوں ہر سو آج اُڑاتا ہے
کیا تجھ کو نیند نہیں آتی　　کیا تیرا دِل گھبراتا ہے
آجا ہاں پیارے اب آجا　　بتلا دے کہاں تو جاتا ہے
جس سمت نگاہیں اُٹھتی ہیں
اندھیاری ہی اندھیاری ہے

خاموش پپیہے پی پی کر　　کس کنج میں تو جا بیٹھا ہے
جس سمت نگاہیں اُٹھتی ہیں
اندھیاری ہی اندھیاری ہے

اِن آم کے پیڑوں کے کنجوں میں مجھ کو وحشت ہوتی ہے
اُڑ کوئیل اُٹھ پھر کُو کُو کر کیا ظالم تو بھی سوتی ہے
کیوں بھینی بھینی خوش بُو کی پُر لُطف فضا کو کھوتی ہے
جس سِمت نگاہیں اُٹھتی ہیں
اندھیاری ہی اندھیاری ہے

اے دریا تیری لہریں کیوں اب ساحل پر نہیں آتی ہیں
اب کیوں نہیں چُہلیں کرتی ہیں اب کیوں نہیں شور مچاتی ہیں
ہو جس سے جوش طبیعت میں وہ نغمہ کیوں نہیں گاتی ہیں
ساحل پہ کھڑا ہوں تنہا میں وہ کیوں نہیں راگ سُناتی ہیں
جس سِمت نگاہیں اُٹھتی ہیں
اندھیاری ہی اندھیاری ہے

یہ رات بھیانک جنگل کی تاریکی سے میں ڈرتا ہوں
اِک پیڑ کے نیچے بیٹھا ہوں اور ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہوں
اکثر میں راتوں کو پیارے بس تجھ کو ڈھونڈا کرتا ہوں
تاریکی میں چھپنے والے میں تیری ادا پر مرتا ہوں
جس سِمت نگاہیں اُٹھتی ہیں
اندھیاری ہی اندھیاری ہے

ایثار

جسونت نے ایک نہایت گہری سانس لیتے ہوئے کہا "نہیں محمود، میں ایسی معمولی باتوں کے لیے تمھیں کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ میں نہیں، میرا ضمیر اس کے خلاف رہنمائی کرتا ہے اور محمود! جب قدرت نے ہمیں تمھیں ایک ہی میدان میں دوڑنے کودنے کے لیے پیدا کیا ہے تو میں اس مقصد کے لیے تمھارے پانو کیوں مانگوں اور تمھیں مجبور کیوں کروں؟"

محمود اپنے دوست جسونت کی خودداری سے بے حد خوش تھا مگر وہ چاہتا تھا کہ جسونت کی مدد ضرور کرے۔ اِس وقت جسونت کے گھر میں سب بیمار تھے۔ اِنفلوئنزا تمام شہر میں سختی کے ساتھ پھیلا ہُوا تھا۔ چھ بیمار اور دو ضعیفوں کی دیکھ بھال کوئی آسان کام نہ تھا۔ قِسمت نے صِرف جسونت کو اِس خِدمت کے لیے محفوظ رکھا تھا، دواؤں اور ڈاکٹروں کے بِل روزانہ ادا کیے جاتے تھے اور دُوسرے روز پھر واجِب الادا ہو جاتے تھے۔ جسونت سخت پریشان تھا۔ اس کے پاس اتنا روپیہ بھی نہ تھا کہ وہ اپنے گھروالوں

کی خِدمت آسانی اور آرام سے انجام دے سکے۔ محمُود سے اُس نے اپنی مجبُوریوں کا ذِکر کیا تو وہ اس کی ہمدردی کے لیے تیار ہوگیا، گو جسونت کا یہ مقصد نہ تھا۔

محمُود ایک امیر گھرانے کا ہونہار لڑکا تھا۔ اُسے خُدا نے ہمدردی کا مادّہ بہُت زِیادہ دیا تھا۔ بعض وقت تو وہ اپنے امکان سے بھی زِیادہ کوشش صرف کردیتا تھا اور یہ اُس کی ایک ایسی خصوصیت تھی جس سے اکثر اشخاص محرُوم تھے۔

(۲)

جسونت کی مُصیبتوں کا حال محمُود کو اچھی طرح معلُوم تھا اور اُس کی سب سے بڑی تمنّا یہ تھی کہ جسونت سے ہمدردی کرے لیکن جسونت کی خودداری اُسے موقع ہی نہیں دیتی تھی آخر ایک دِن محمُود نے پانچ سو رُپے ایک تھیلی میں بھرے، تھیلی ایک باغ کی کسی روِش پر حِفاظت سے رکھدی اور جسونت کو لے کر صُبح سویرے وہاں پہُنچ گیا۔ باتوں میں جسونت کی نِگاہ تھیلی پر پڑگئی۔ وہ بولا "محمُود! دیکھنا یہ کیا پڑا ہو" محمُود کی نِگاہ تو اُس طرف ضرُور پڑی مگر اِس لیے کہ جسونت میں غیرت اور خُودداری کا جذبہ پھر نہ پیدا ہوجائے اُس نے اس بات

کو کچھ اہمیت نہ دی۔ محمود نے نہایت بے رُخی اور لاپروائی سے اپنی روشن آنکھیں دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا "کچھ پڑا تو ہے" اور دوسری باتوں میں مصروف ہوگیا۔ جسونت باتیں کرتے کرتے تھیلی کی طرف بڑھا، اُسے اُٹھایا، دیکھا معلوم ہُوا کہ رُپیوں سے بھری ہوئی ہے، اُس نے تھیلی وہیں رکھ دی اور ہاتھ سے ہاتھ جھاڑتے ہوئے محمود پر نگاہِ اِستفسار ڈالی اور اس کے پاس چلا آیا۔ محمود نے نہایت متانت سے پوچھا۔ "کیوں جسونت وہ کیا چیز ہے؟ شاید کوئی فقیر اپنی جھولی بھول گیا ہے یا مالی کی قینچیاں اس پوٹلی میں بندھی ہوئی ہیں؟" "نہیں محمود" جسونت اپنے بعض خیالات چھپاتے ہوئے یا فنا کرتے ہوئے زرا آواز سے بولا "اس میں تو بہت سے رُپے ہیں رُپے! نہ معلوم اِتنے رُپیوں کی تھیلی یہاں کون چھوڑ گیا؟" محمود نے یقین دِلانے والے لہجے میں اپنی روشن آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ یہ تو مجھے خُدا کا عطیہ معلوم ہوتا ہے جو اُس نے تمھاری ضرورتوں کا اِحساس کرکے اپنے خزانۂ غیب سے بھیجا ہے! کیوں جسونت! کیا یہ بات نہیں ہے؟"

جسونت نے مُسکرا کر جواب دیا "محمود! تمھیں ضرور

معلوم ہوگا کہ آسمانوں پر کوئی ٹکسال نہیں ہی،
یہ تو کسی چور کی بھول کا نتیجہ ہی جو رات کو کہیں سے
چُرا کر لایا اور یہاں کسی وجہ سے چھوڑ گیا۔ میں اُس کے
دل کی گھبراہٹ کی آواز اپنے کانوں سے سُن رہا ہوں
جس کے قبضے سے اِتنا رُپیہ نِکل گیا ہی۔ کیا تم نہیں سُنتے
محمود؟... اچھا آؤ ہمیں یہاں ٹھیرنا مُناسب نہیں، مُمکن ہی
کہ ہم بھی کسی مُصیبت میں مُبتلا ہو جائیں" اُس نے محمود
کا ہاتھ پکڑ لیا اور باغ سے باہر کی طرف چلا۔ مگر محمود
نے اُسے نہایت لاپرواہی کے انداز سے روکا۔ "چلے جانا
جسونت، ٹھیرو بھی، ابھی تو سورج نکلنے میں غالباً آدھ
گھنٹہ باقی ہی" اور کہنے لگا کہ "میری رائے میں یہ تھیلی
تمھیں یا مجھے اُٹھا لینی چاہیے۔ تمھیں اس لیے کہ رُپے کی
سخت ضرورت اور مجھے اِس لیے کہ اگر تم نہ اُٹھاؤ تو
میں یہ غلطی کیوں کروں۔ یہ تھیلی یہیں تو پڑی رہ نہیں
سکتی، کوئی نہ کوئی ضرور اُٹھا لے گا۔ پھر ہم ہی اِسے
کیوں نہ لیں؟ اس میں نہ کسی کے ساتھ زبردستی ہی، نہ
چوری ہی، نہ ظُلم ہی، بلکہ یہ ایک غیبی عطیہ ہی جس کی ہمیں
ضرور قدر کرنی چاہیے۔ جسونت! جو خزانے زمین میں دفن
ملتے ہیں وہ کسی نہ کسی کی مِلکیت ضرور ہوتے ہیں۔ مگر

جسے خزانہ مِلتا ہی (وہ کھوئی ہوئی چیز جو اپنے مالِک کے قبضے میں کبھی واپس نہیں جاسکتی) وہ اُس سے ضرور فایدہ اُٹھاتا ہی۔ ملتی ہوئی دولت کو ٹھکرا دینا خُدا کی نعمتوں سے مُنہ پھیرنا ہی" جشونت پر محمود کے اس وعظ کا کُچھ اثر نہ ہُوا۔ وہ پوری نفرت کے ساتھ تھیلی کو دیکھتے ہوئے روانہ ہوجانے پر آمادہ ہوگیا۔ اُس نے کہا "بیمار اُٹھ بیٹھے ہوں گے مجھے فوراً واپس جانا چاہیے" محمود نے اپنی کوششوں کو ناکام ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ جشونت کو روک نہ سکا مگر باغ کے دروازے تک اُسے چھوڑکر لوٹ آیا، اِس عُذر پر کہ اُسے باغ کے دوسرے راستے سے ایک ضروری کام سے اپنے چچا کے گھر جانا ہی۔

(۳)

اِن واقعات کو پانچ روز گزر چُکے ہیں۔ جشونت آج بے حد پریشان ہی۔ دو روز سے اُس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ وہ اب قرض خواہوں کے بِل بھی ادا نہیں کرسکتا، جِن کی تعداد پندرہ سے اوپر ہوگئی ہی۔ اس کے دو بھائیوں کا ایک ساتھ انتقال ہوچکا ہی۔ ابھی ماں باپ اور بہنیں بیمار ہیں۔ وہ گھبرایا ہُوا ہی، مگر اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے، اُس کے اِرادے کی قوتیں

کمزور ہو چکی ہیں، وہ بیمار سا معلوم ہوتا ہے۔ رُپے کے ختم ہو جانے سے وہ بہت پریشان ہے، قرض لینا اُس کی عادت نہیں دوستوں کو تکلیف دینا اُس کی غیرت کے خلاف ہے۔ آخر وہ اب کیا کرے اور مصیبتوں کے پہاڑ کو کس طرح کاٹے؟ جسونت ابھی پریشاں حال، ننگے سر، گھر سے نکل کر باہر کے دروازے پر چوکھٹ تھامے مغموم کھڑا تھا اور راستے میں آنے جانے والوں کے چہروں پر نگاہیں جما جما کر اُن کی ذہنی و جسمانی تکلیفوں یا مسرّتوں کا اندازہ لگا رہا تھا کہ یکایک چِٹھی رساں نے اُسے ایک رجسٹری بیمہ دیا۔ جسونت نے پوچھا: "اچھی طرح دیکھ لو، خوب سوچ لو، یہ کسی دوسرے جسونت کا تو نہیں ہے؟" چِٹھی رساں نے کہا "نہیں مسٹر جسونت! یہ بیمہ آپ ہی کا ہے، ولدیت، سکونت، مکان کا پتہ، غرض کہ ہر بات صاف صاف لکھی ہوئی ہے"۔ جسونت نے دستخط کر کے بیمہ لے لیا۔ وہیں کھڑے کھڑے اُسے کھولا۔ ایک خط اور پانچ سو رُپے کے نوٹ اُس میں ملے۔ خط میں لکھا ہُوا تھا:

"پیارے عزیز۔ تمھارے والد نے مجھے پانچ سو رُپے قرض دیے تھے، اُسے نو برس کا عرصہ گزر چکا۔ تُم اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ میں

نے سُنا ہے وہ بیمار ہیں اور تم پریشان ہو، رُپیہ
واپس کرتا ہوں، رسید سے اطلاع دینا۔ خُدا
کرے میرا دوست اچھا ہوجائے اور پریشانیاں
جلد دُور ہوسکیں

تمھارا سیوک: رام پرشاد اگروال
نئی بستی۔ اِلہ آباد"

جسونت کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں اُس نے
بہ مُشکِل اپنے دل کو سنبھالا اور کچھ سوچتا ہُوا اندر چلاگیا۔

(۴)

"میری مُصیبتیں بہت بڑی حد تک ختم ہوچکی ہیں۔
میں اپنے تمام قرض خواہوں کا قرض ادا کرنے کے قابِل
ہوگیا ہوں۔ اب مجھے بیماروں کے عِلاج میں زیادہ آسانی
ہوجائے گی" جسونت اپنے مغمُوم دِل میں یہ خیالات
لیے ہوئے گھر سے باہر نِکلا ہی تھا کہ اُسے ایک بھیڑ
آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ ٹھیر گیا۔ جب یہ جماعت سامنے
سے گزری تو اُس نے دیکھا کہ اس کے ایک پُرانے ہم مدرسہ
کو پولس والے ہتھکڑی ڈالے لیے جارہے ہیں۔ اس کے
دِل میں ایک جوش پیدا ہوا اور بجلی کی طرح اُس مجمع میں
پہنچ گیا۔ اُس نے پُوچھا "یہ کِس قصوُر میں گرفتار کیا گیا ہے؟"

پولس والوں نے روکھے پن سے جواب دیا۔ "قمار بازی کی علت میں" جسونت نے نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا "کیا جرم ثابت ہوچکا ہے؟" "ہاں، پانچ سو روپیہ جرمانہ مجسٹریٹ نے تجویز کیا ہے جسے یہ شخص ادا نہیں کرسکتا اور اب قید خانے جارہا ہے"

جسونت نے اس کے بعد کچھ نہ پوچھا۔ وہ تانگے میں فوراً سوار ہوکر کچہری پہنچا۔ مجسٹریٹ کے کمرے میں داخل ہوا اور پانچ سو روپے کے نوٹ میز پر رکھ کر کہنے لگا "یہ پریمی کا جرمانہ ہے، اس کی رہائی کا حکم مجھے دیجیے" مجسٹریٹ صاحب نے اس کا نام لکھا، کچھ اور باتیں دریافت کیں اور رہائی کا حکم لکھ کر عدالت کی مہر لگادی۔

جسونت اسی تانگے پر سوار ہوا اور سیدھا جیل خانے پہنچا۔ داروغۂ جیل کو حکم دکھایا۔ پریمی ابھی اپنے کمرے میں بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ رہائی کا حکم اسے پہنچ گیا۔ وہ کچھ شرمندہ سا جیل خانے سے نکلا۔ داروغہ نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ جسونت اس کے باہر آنے سے پہلے ہی چل دیا تھا۔ پریمی حیران تھا کہ اس کا جرمانہ کس نے ادا کردیا۔ اس نے چاہا کہ داروغہ سے دریافت کرے مگر یہ مناسب نہ سمجھا اور سیدھا گھر

چلا آیا۔ جشونت کی مصیبتیں بدستور امتحان لے رہی تھیں۔ مگر اُس کا ایثار اس پر رحمتیں اور برکتیں برسا رہا تھا۔ خدا کو اُس کا یہ کام بہت پسند آیا۔ دو چار روز میں اُس کا گھر بیماری سے پاک ہوگیا، سب تندرست ہوگئے اور اُس کے باپ نے تندرست ہوتے ہی فوراً رُپے کا کافی انتظام کرلیا۔

کئی ہفتے گزر جانے کے بعد ایک دِن اُسے معلوم ہُوا کہ پانچ سو رُپے جو اُسے ملے تھے وہ محمود نے کِسی کے نام سے بھیج دیے تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ جشونت کی غیرت اُس کے رُپوں کو منظور نہیں کرسکتی اس لیے وہ مجبور تھا کہ کِسی دوسری ترکیب سے رُپے اُس تک پہنچائے۔ لیکن جب محمود کو جشونت کے "اِیثار" کا حال معلوم ہُوا تو وہ حیران ہوگیا اور کہنے لگا "میں نے رُپیہ جس ہمدردی کے جذبے سے لبریز ہوکر بھیجا تھا جشونت نے اُسی جذبے سے متاثر ہوکر اُسے دوسرے شخص پر صرف کردیا۔ یہ غیبی انتظامات ہیں۔ قدرت اپنے انتظامات خود کرتی ہے اور کوئی کسی کی مدد نہیں کرسکتا۔ میری ہمدردی کچھ زیادہ قیمتی نہیں، جشونت کا اِیثار بے شک تعریف و تحسین کے قابِل ہے۔

محنت



(۱)

تم کو خیالِ محنت گر صبح و شام ہوگا
کہتے ہیں بخت جس کو وہ بھی غُلام ہوگا
جو دل کا مُدعا ہے حاصل تمام ہوگا
محنت سے کام ہوگا محنت سے نام ہوگا
محنت کرو عزیزو! محنت سے کام ہوگا

(۲)

محنت بغیر جینا مُمکن نہیں جہاں میں

محنت سے وہ بنا ہے رہتے ہو جس مکاں میں
محنت کا پھل ہیں پودے جتنے ہیں گلستاں میں
محنت ہی کے ہیں تنکے بلبل کے آشیاں میں
محنت کرو عزیزو! محنت سے کام ہوگا

(۳)

محنت نہ گر برس دن کرتا کسان بچارا
پیدا نہ ہوتا غلّہ ہوتا نہ گھاس چارا
محتاج روٹیوں کو پھرتا جہان سارا
ہر شخص کو جہاں میں محنت کا ہے سہارا
محنت کرو عزیزو! محنت سے کام ہوگا

(۴)

گر چاہتے ہو عزّت! محنت سے وہ ملے گی
درکار اگر ہے شہرت! محنت سے وہ ملے گی
ہے جس کا نام دولت محنت سے وہ ملے گی
کہتے ہیں جس کو قسمت محنت سے وہ ملے گی
محنت کرو عزیزو! محنت سے کام ہوگا

(۵)

محنت نے کارِ مشکل آسان کر دکھائے
چیرے پہاڑ لاکھوں دریا کئی بہائے

پربت کی چوٹیوں پر اپنے مکاں بنائے
بیڑے سمندروں میں محنت نے ہیں چلائے
محنت کرو عزیزو! محنت سے کام ہوگا

(۶)

محنت سے اے عزیزو! غافل کبھی نہ ہونا
ہشیار و چست رہنا کاہل کبھی نہ ہونا
گر کام سخت بھی ہو بے دل کبھی نہ ہونا
دیکھو اپاہجوں میں شامل کبھی نہ ہونا
محنت کرو عزیزو! محنت سے کام ہوگا

سوالات

۱۔ معنے بتاؤ :۔

پربت ، اپاہج ، مدعا ، بخت ۔

۲۔ اِن اشعار کی تشریح کرو :۔

پربت کی چوٹیوں پر ہیں رہگزر بنائے
بیڑے سمندروں میں محنت نے ہیں چلائے
محنت بغیر جینا ممکن نہیں جہاں میں
محنت لگی ہوئی ہے بلبل کے آشیاں میں

جاڑا اور گرمی

ایک دِن جاڑے نے گرمی سے کہا
میں بھی ہوں کیا خوب موسم واہ وا
ہی بجا گر کیجیے میری صِفت
ہی روا گر کیجیے میری ثنا
میں جہاں میں ہوں زبس ہر دلعزیز
مانگتے ہیں میرے آنے کی دُعا
میرے آنے سے نہ ہو کیوں خرّمی
کیا خُنک پانی ہی کیا ٹھنڈی ہوا
چاندنی ہی بے کدُورت بے غبار
آسماں ہی صاف، نیلا، خوشنما
رات گرمی کی تو کُچھ ہوتی نہ تھی
دِن کی محنت سب کو دیتی تھی تھکا
میری آمد نے کیا شب کو دراز
میرے آنے نے دیا دن کو گھٹا
لوٗ مسافر کا جُھلس دیتی تھی مُنہ
اور زمیں تلوؤں کو دیتی تھی جلا

اب ہوا بھی اور زمیں بھی سرد ہی
کھو دیا میں نے حرارت کا پتا
مِل گئی کتنے بکھیڑوں سے نجات
ٹٹّیاں موقوف پنکھا چھُٹ گیا
دھوپ کا ڈر ہی نہ لُو کا خوف ہی
اِن دِنوں کی دھوپ ہی گویا غِذا
سُورج اب کتَرا کے جاتا ہی نِکل
فصلِ تابستاں میں تھا سر پر چڑھا
میرے دم سے تندُرستی بڑھ گئی
پائی مُدّت کے مریضوں نے شِفا
ڈاکٹر صاحب کو فُرصت مِل گئی
اب شِفا خانے میں ہی کم جمگھٹا
ضُعفِ معدہ کی شکایت مٹ گئی
بے دوا خود بڑھ گئی ہی اِشتہا
مکھیاں بھی رہ گئی ہیں خال خال
بے تکلف اب ہی کھانے کا مزا
گرم پوشاکوں نے اب پایا رواج
میں نے بخشا آن کر خلعت نیا
سِل گئے توشک لبادے اور لحاف

درزیوں نے پایا محنت کا صِلا

میرے ہوتے کون پوچھے برف کو
باسی پانی برف کا بھی ہے چپا

ندی نالوں کا گیا پانی نِتھر
جھیل اور تالاب نے پائی صفا

طالبِ علم اب کریں گے کوششیں
کوششوں سے ہوگا پورا مدعا

ٹھیک وقت اُن ورزشوں کا ہے یہی
تندرستی کا ہے جن سے فائدا

حاکموں نے کردیا دورہ شروع
تا کریں دردِ رعایا کی دوا

سیب، نارنگی، بہی، لیموٗ، انار
میوہ ہر اک قسم کا بکنے لگا

تخم ریزی جنسِ اعلیٰ کی ہوئی
کھیت میں بویا گیا گیہوں چنا

عید کی سی دھوم ہے دیہات میں
پک گئی ایکھ اور کولھو چل پڑا

ہے مٹھائی کی نِہایت ریل پیل
چل رہی ہے آج کل میٹھی ہوا

اُنس ہے محنت مشقت سے مجھے
کاہلی کو میں نہیں رکھتا روا

محنتی ہیں مجھ سے خوش میں اُن سے خوش
کاہلوں کا میں نہیں ہوں آشنا

سُن کے یہ باتیں ہوئی گرمی بھی تیز
اور جل کر یوں جواب اُس کو دیا

آپ اپنے مُنہ میاں مِٹھو نہ بن
خود ستائی عیب ہے او خود ستا

اُس کو ہوتا ہی نہیں حاصل کمال
جو کہ اپنے آپ کو سمجھے بڑا

باہُنر تو سرکشی کرتے نہیں
بلکہ سر کو اور دیتے ہیں جھکا

تونے شاخوں کے لیے پتّے کھسوٹ
تونے پیڑوں کو برہنہ کر دیا

میرے آنے سے پھلے پھُولے شجر
سبز پوشاک ان کو کی میں نے عطا

میں نے شاخوں پر لگائے برگ و بار
ورنہ کیا تھا اِن میں ایندھن کے سوا

کھیت جاڑے بھر تو کچّے ہی رہے

ہاں مگر میں نے دِیا اُن کو پکا
خُشک چشمے بھر گئے دریا چڑھے
دیکھ لے میرا کرم میری سخا
تجھ سے تھی مخلوق میں افسُردگی
کون خوش تھا جُز گروہِ اغنیا
میری آمد نے مُساوی کردیا
راحت و آرام میں شاہ و گدا
کردیا میں نے رگوں میں خوں رواں
ٹھنڈ سے شل ہوگئے تھے دست و پا
میں نے کھولے آن کرتن کے مسام
کیوں کہ تھا رُکنا پسینے کا بُرا
رات بھر رہتی تھی خلقت گھر میں بند
کردیا اس بند سے میں نے رِہا
میں نے حکمت سے چلائیں آندھیاں
تا بدل جائے مکانوں کی ہوا
میں سمندر سے اُٹھاتی ہوں بُخار
جِس سے چھا جاتی ہے ملکوں پر گھٹا
چہرۂ گردُوں کا یہ گرد و غُبار
ابر کے آنے کا دیتا ہے پتا

رات پر دن کو نہ کیوں ترجیح دوں
رات ہے تاریک دن ہے پُر ضیا
ہے ہمیشہ ابتدا میری بہار
ہے سدا برسات میری انتہا
تھیں بہت دونوں کی تقریریں دراز
اور طولانی بیانِ ماجرا
سُن کے ان دونوں کی یہ کج بحثیاں
ایک دانا نے کیا یوں فیصلا
کچھ نہیں ہے اس میں جاڑے کا قصور
کچھ نہیں ہے اس میں گرمی کی خطا
جب حقیقت پر نہیں ہوتی نظر
یوں ہی رہتا ہے بہم شکوہ گلا
ہے حرارت کی کمی بیشی فقط
ورنہ جاڑا کون اور گرمی ہے کیا؟

سوالات

۱۔ ذیل کے الفاظ اور محاورات کے معنے بیان کرو:۔
زلبس ، اشتہا ، خلعت ، برہنہ ، اغنیا ، مسام ، گردوں ، ضیا ، کج بحثی ،

کدُورت ، تنا

۲۔ شل ہو جانا ، ترجیح دینا ، سرکشی کرنا ، روا رکھنا اور خال خال رہ جانا کو جملوں میں استعمال کرو۔

۳۔ اِن اشعار کی تشریح کرو۔

آپ اپنے مُنہ میاں مِٹھو بن   خود ستائی عیب ہے او خود ستا

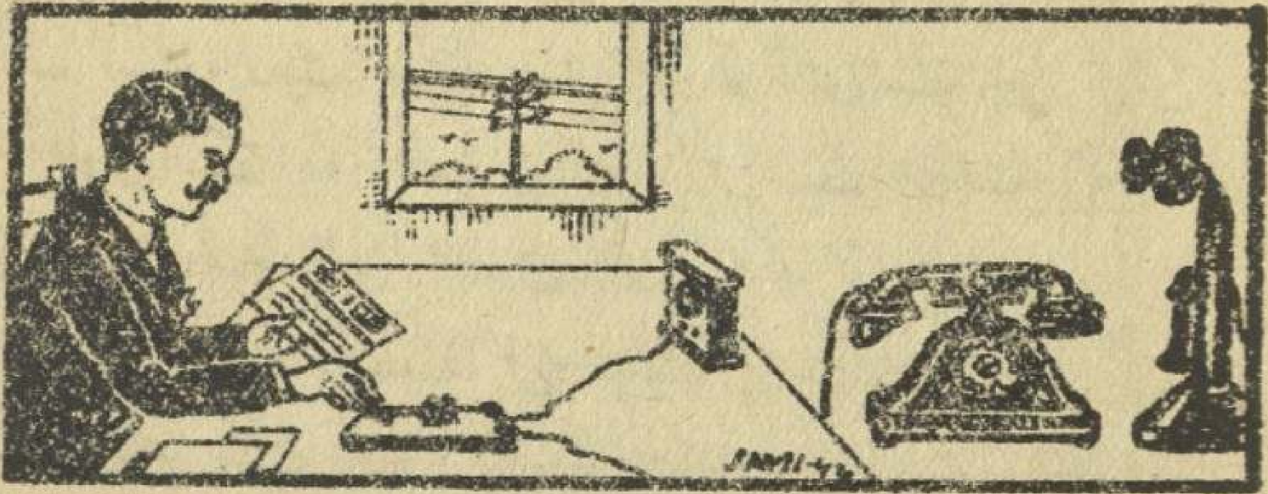
چہرۂ گردُوں کا یہ گرد و غبار   ابر کے آنے کا دیتا ہے پتا

سُورج اب کترا کے جاتا ہے نکل   فصلِ تابستاں میں تھا سر پر چڑھا

۴۔ جاڑے نے اپنی تعریف میں کیا کہا؟

۵۔ گرمی نے جاڑے کی تقریر کا کیا جواب دیا؟

تار اور ٹیلیفون



تم نے چٹھی رساں کو گھر گھر خطوط پہنچاتے تو دیکھا ہوگا لیکن اس کے علاوہ اور دوسرے بھی خبر رسانی کے ذرائع ہیں۔ مثلاً ایک سلسلہ ہے جس کو ٹیلیگراف کہتے ہیں اس کے ذریعے پیغام ذرا کی ذرا میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔

سب سے پہلا ٹیلیگراف ایک "فضائی پیغام" تھا جو روشنی کے ذریعے سے بھیجا جاتا تھا۔ قدیم ایام سے انسان آگ کے ذریعے سے دور دراز مقام کو پیغام بھیجتا تھا۔ جب ۱۱۸۴ ق۔م میں ٹرائے (واقعہ ایشیائے کوچک) پر یونانیوں نے قبضہ کرلیا تو ایک پہاڑ پر مشعل روشن کرکے دوسرے

پہاڑ کو اس کی خبر دی گئی اور دُوسرے پہاڑ سے تیسرے کو، اس طرح تمام مملکتِ یُونان میں یہ خبر پُہنچ گئی۔ یُونانیوں نے اس سِلسلے میں مُتعدّد اِیجادیں کیں۔ مِنجملہ اِن کے ایک اِیجاد یُونانیوں کے مشہُور مُؤرّخ پولی بِیُس کی ہے۔ یہ شخص ۱۵۰ء ق۔م میں موجود تھا۔ پولی بیُس نے جب آگ کے ذریعے سے پیغام بھیجا تو اُس نے پانچ پانچ مِشعلوں کے دُو حصّے بنائے۔ اُس نے حرُوف تہجّی کو بھی پانچ پانچ کرکے پانچ حصّوں میں تقسیم کیا تھا۔

مِشعلیں ایک خاص طریقے پر روشن کی جاتی تھیں تاکہ پیغام بھیجنے میں غلطی کا اِمکان نہ رہے۔ مثلاً پیغام اگر پہلے حصّے کا تیسرا حرف (ک) ہو تو ایک گروہ کی تین مشعلوں سے تیسرا حرف ظاہر ہوگا۔ اُصُول کے لحاظ سے یہ طریقۂ عمل مکمّل تھا کیوں کہ اس کے ذریعے سے ہر قِسم کا پیغام بھیجا جا سکتا تھا۔ لیکن عملی طور پر اس کی قدر و قیمت نہ تھی کیوں کہ اِس میں کافی مِشعلوں اور اشاروں کی ضرُورت ہوتی تھی، حتّٰی کہ چند الفاظ کے بھیجنے کرنے میں رات ختم ہوجاتی تھی۔

اگرچہ پولی بُیس کے تجویز کیے ہوئے اشارات زیادہ مقبُول نہیں ہوئے تاہم عہدِ قدیم اور زمانۂ وسطیٰ میں صدیوں

تک فوری اور اہم پیغامات کی ترسیل کے لیے آگ ہی سے کام لیا جاتا تھا۔ سترھویں صدی میں ٹیلیگراف کا ایک جدید طریقہ رائج ہوا۔ مارکوئیس آف ورسسٹر نے جس کو ایجادات کی دھن تھی ۱۶۶۳ء میں اعلان کیا کہ اس نے ایک ایسا طریقہ دریافت کرلیا ہی جس کے ذریعے سے پیغامات بھیجے جاسکتے ہیں۔ لیکن مارکوئیس کا یہ ٹیلیگراف اُس کی دیگر "ایجادات" کی طرح زیادہ تر کاغذی پیرہن میں تھا۔ ۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر رابرٹ ہک ساکن انگلستان نے ایک طریقہ ایجاد کیا جس کے ذریعے سے تیس چالیس میل کے فاصلے تک فضائی پیغامات بھیجے جاسکتے تھے۔ ڈاکٹر ہک کی تجویز یہ تھی کہ پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر لمبے لمبے بانس نصب کیے جائیں اور اُن پر ایک بانس متوازی لگاکر اس میں چرخیاں لگائی جائیں جن کے ذریعے سے انگریزی زبان کے حرُوف تہجّی کا جو حرُوف منظور ہو کھینچ کر اوپر تک پہنچایا جاسکے۔ اس طرح پیغام کے الفاظ کے حرُوف یکے بعد دیگرے اوپر پہنچتے رہیں گے اب رہا یہ سوال کہ زیادہ فاصلے سے یہ حروف کیوں کر پڑھے جاسکتے تھے تو اس کا جواب یہ ہی کہ اُسی زمانے میں دُوربین ایجاد ہوچکی تھی اور اس کی مدد سے اِن حرُوف کو بآسانی پڑھا جاسکتا تھا۔ لیکن اِس سِلسلے

میں اعلیٰ دریافت پیرس کے فرانسیسی مُسمّی کلاڈ شیپ کی تھی۔ انقلاب فرانس کے زمانے (۱۷۹۳ء) میں اُس نے محل کی چھت پر ایک ستون کھڑا کیا اور اس پر ایک آڑا شہتیر قایم کیا جو ہر سمت میں گھمایا جا سکتا تھا۔ شہتیر میں دو بازو لگے تھے جو رسّی کے ذریعے سے حرکت کرتے تھے۔ شیپ نے ان بازوؤں کی حرکتوں کو حروف ہجی سے منضبط کیا تھا۔ محلات کے مناروں پر اسی قسم کی مشینیں قایم کی گئی تھیں اور ان کے ذریعے سے دس بارہ میل تک پیغام بھیجا جا سکتا تھا، لیکن تھوڑے ہی عرصے میں وہ پیرس سے لل (فاصلہ ۱۳۰ میل) تک پیغام بھیجنے لگا۔ پیغام ایک منار سے دوسرے منار کو بہت جلد روانہ کیے جاتے تھے۔ ان مشینوں پر کام کرنے والا ایک گھنٹے میں ایک سو الفاظ آسانی سے بھیج سکتا تھا۔ اس مشین کے بازووں میں رات کے وقت کام کرنے کے لیے لیمپ روشن رہتے تھے۔

کچھ شک نہیں کہ خبر رسانی کے سلسلے میں شیپ کی ایجاد نہایت اہم تھی اور چوں کہ عملی طور پر بھی یہ خوب کامیاب رہی اس لیے تھوڑے ہی دنوں میں انگلستان اور دیگر ممالک میں شیپ کے طریقے سے کام لیا جانے لگا

اور ہر جگہ اس طریقے کے گُن گائے جانے لگے۔ لیکن بہت جلد اس فضائی خبر رسانی کا ایک خطرناک رقیب پیدا ہوگیا۔ شیپ کی ایجاد سے بہت پہلے لوگ برقی ذریعے سے خبر رسانی کے امکانات کے تجربے کر رہے تھے۔ یہ تجربے ۱۷۲۸ء میں شروع ہوئے جب کہ ایک انگریز مسمّٰی گرے ایک خاص تجربے میں کامیاب بھی ہوا۔ ۱۷۴۸ء بین جمن فرنکلن نے ایک تار کے ذریعے سے بہت دور تک برقی رَو بھیجی۔ تار کے دوسرے سرے پر خالص شراب رکھی گئی تھی اور اس تجربے میں اُسی میں بجلی کے ذریعے سے آگ لگائی گئی تھی۔ ۱۸۱۹ء میں کوپن ہیگن کے ایک پروفیسر نے تجربہ کیا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اگر ایک سوئی کو کسی ایسے جسم کے قریب کیا جائے جس میں سے برقی رَو گزر رہی ہو تو سوئی بھی اثر قبول کرلے گی اور اس جسم کے زاویۂ صحیحہ میں قایم رہے گی۔ ۱۸۲۵ء میں ولیم اسٹرجن ساکن انگلستان نے مُلایم لوہے کی چھڑ کا ایک ٹکڑا لے کر موڑا اور اُس پر تانبے کا تار لپیٹا اور معلوم کیا کہ جب تار میں سے برقی رَو گزر رہی ہو تو لوہے کی سوئی کو اپنی طرف کھینچتی ہو اور جب برقی رَو بند کردی جاتی ہو تو لوہے کی چھڑ میں وہ قوت باقی نہیں رہتی۔ اوئر سٹڈ

اور اسٹرجن کی ان دریافتوں کے باعث الکٹرو میگنٹ کی
ایجاد ظہور میں آئی اور اس کی دریافت نے برقی ٹیلیگراف
کی ایجاد کی طرف رہنمائی کی۔ ۱۸۳۱ء میں امریکہ کے ایک
نامور سائنس داں پروفیسر جوزف ہنری نے ایک طریقہ
دریافت کیا جس کے ذریعے سے دور دراز فاصلے پر ایک
تار سے برقی رو بھیجی جاسکتی ہے۔ اس سے اگلے سال
(۱۸۳۲ء) پروفیسر ہنری نے ایک آلہ بنایا جو حقیقی معنوں
میں برقی ٹیلیگراف تھا۔ پروفیسر ہنری نے اپنے آلے کے
ذریعے سے ایک میل کے فاصلے پر گھنٹی بجائی تھی۔ اب
گویا دور دراز کے مقامات کے پیغام بھیجنے کا ایک عمدہ
ذریعہ پیدا ہوگیا۔

لیکن اس وقت تک برقی ٹیلیگراف کی حیثیت ایک
کھلونے سے زیادہ نہ تھی۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اس
کو کیوں کر کارآمد بنایا جائے اور کیا طریقہ اختیار کیا جائے
کہ اس کے ذریعے سے کامیابی کے ساتھ خبررسانی کا کام
لیا جاسکے؟ متعدد مؤجد تجربات میں مصروف ہوگئے تاکہ کوئی
بہترین طریقہ دریافت کرسکیں۔ ۱۸۳۷ء میں پیڈنگٹن اور
ڈریٹن کے مابین (فاصلہ ۱۳ میل) تار کا سلسلہ قایم کرکے
پیغام بھیجا گیا مگر اس تجربے میں کامیابی نہ ہوئی۔ ایک

۱۸۴۳ء میں اس کو تیس ہزار ڈالر کی رقم عطا کی گئی تاکہ بالٹیمور اور واشنگٹن کے درمیان برقی ٹیلیگراف کا سلسلہ قایم کرے۔ مارس اور ویل دونوں نے سخت محنت و کوشش کی، حتیٰ کہ مئی ۱۸۴۴ء میں یہ سلسلہ قایم ہوگیا۔ اُس زمانے میں ٹیلیگراف کے آلے کا وزن ۱۸۵ پونڈ تھا، حالانکہ آج اس کا وزن چار اونس سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ بہر حال یہ آلہ چاہے وزنی اور بھونڈا ہی کیوں نہ ہو تاہم اس نے خوب کام دیا۔

مارس کا طریقۂ عمل بہت کامیاب اور نفع بخش ثابت ہؤا۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں تمام دُنیا میں یہ سلسلہ قایم ہوگیا۔ خود امریکہ میں ۱۸۶۰ء تک تمام مشہور شہروں میں یہ سلسلہ قایم ہوگیا اور ۱۸۶۱ء میں ایک سلسلہ نیویارک اور سان فرانسس کو کے درمیان قایم ہؤا۔ اس کے پانچ برس کے بعد (۱۸۶۶ء) نئی دنیا اور پُرانی دُنیا میں بھی برقی ٹیلیگراف کا سلسلہ قایم ہوگیا۔

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس سلسلے کے ساتھ خبر رسانی کی داستان ختم ہوگئی۔ جب مُوجدوں نے معلوم کرلیا کہ کیوں کر ایک تار کے ذریعے سے برقی رَو دور دراز فاصلے پر بھیجی جاسکتی ہے تو اُنھیں خیال پیدا ہؤا کہ کیا وجہ ہے کہ اِسی

کے ذریعے سے انسان کی آواز بھی نہ بھیجی جاسکے۔ ٹیلیگراف کی ایجاد و تکمیل کے بعد ہی وہ ٹیلیفون بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ ۱۸۵۵ء میں انگلستان کے ایک پروفیسر مُسمّی وھیٹ اسٹون نے ایک آلہ ایجاد کیا جس کے ذریعے سے گانے بجانے کی آواز عمارت کے ایک کمرے سے مُتعدّد کمروں کے بعد عمارت کے آخری حصّے میں سُنی جاسکتی تھی۔ اِسی زمانے میں ایک فرانسیسی نے بھی ایک آلہ ایجاد کیا جس کے ذریعے سے فاصلے پر ایک شخص کی بات چیت سُنی جاسکتی تھی۔

۱۸۷۴ء میں پروفیسر الگزنڈر گراہم بیل کو بھی اسی طریقے سے مِلتا جُلتا ایک طریقہ سوجھا اور اسی کے مطابق اُس نے ایک آلہ بنایا۔ مارس کی طرح بیل کے پاس بھی روپیہ نہ تھا، لیکن اس کے احباب نے اِس کی دستگیری کی۔ آخر کار ۱۸۷۶ء میں اس نے ایک مشین ایجاد کرلی جس کے ذریعے سے انسان کی آواز ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ سکتی ہے۔ یہی ٹیلیفون تھا۔ شروع شروع میں ٹیلیفون محض کھلونا تھا جو بہت تھوڑے فاصلے تک کام دے سکتا تھا۔ لیکن اس میں بتدریج اصلاحیں ہوتی گئیں اور اب یہ کیفیت ہے کہ دیگر شہروں کا کیا ذِکر

دوسرے ملکوں سے بھی ٹیلیفون پر بات چیت کی جاسکتی ہے۔

سوالات

۱۔ ان لفظوں کے معنی بتاؤ:۔

کاغذی پیرہن، متوازی، ترسیل، شہتیر، منضبط، زاویۂ صحیحہ، مُرادف، عارضی۔

۲۔ گن گانا، اخذ کرنا، بتدریج، موجد، دستگیری کرنا اور مُنہمک ہونا کو جملوں میں استعمال کرو۔

۳۔ ان لفظوں کے واحد بتاؤ:۔ خطوط، احباب، ذرایع، نقاط۔

۴۔ وارسسٹر اور شیپ نے فضائی پیغامات روانہ کرنے کے لیے کون سے طریقے ایجاد کیے۔

۵۔ الکٹرومیگنٹ کی ایجاد کس طرح ظہور میں آئی اور کس شخص نے اس ایجاد سے فایدہ اُٹھاکر موجودہ ٹیلیگراف ایجاد کیا۔

۶۔ ٹیلیفون بنانے کا خیال کس طرح پیدا ہوُا اور اس ایجاد میں رفتہ رفتہ جو ترقیاں ہوئی ہیں بیان کرو۔

۷۔ جانا، کرنا، بڑھنا، بھیجنا سے فعل امر، فعل نہی اور فعل مضارع کے صیغے بناؤ اور بتاؤ کہ مضارع کے صرف چھ صیغے کیوں آتے ہیں۔

صُبحِ بہار

اللہ اللہ! لطفِ صُبحِ بہار — اک عجب کش مکش میں ہے گلزار

پھر رہی ہے نسیم اِٹھلاتی — اس طرف آتی اُس طرف جاتی

کبھی پھولوں کو چھیڑ آتی ہے — کبھی غنچوں کو جا ہنساتی ہے

کبھی شاخوں کو جا ہلا آئی — گُل کو جھُولا کبھی جھُلا آئی

سبز پتّوں پہ قطرے شبنم کے — نظر آتے ہیں صاف موتی سے

نیم وا ہے ابھی کلی کوئی — اور کوئی کھِل کے پھُول بن بیٹھی

اِبتدا میں وہ باہمی اُلجھاؤ — ایک کا دوسرے کے ساتھ لگاؤ

پھر وہ کھِلنے کا خوش نما منظر — پھیلنا پنکھڑی کا تھم تھم کر

بُلبلیں چہچہے سُناتی ہیں — چڑیاں آپس میں نغمے گاتی ہیں

الغرض ہے عجب سماں ہادی

کیا ہو تعریف اُس کی قدرت کی

سوالات

۱. معنے بتاؤ:- کش مکش، اٹھلانا، نیم وا۔

۲. تیسرے اور چوتھے شعر کی تشریح کرو۔

۳. ذیل کے جملوں کی تصحیح کرو:-

نسیم نے اٹھلاتی پھر رہی ہے۔ نسیم پھولوں کو چھیڑی۔ گلزار نے عجب کش مکش میں ہے۔

سر سیّد احمد خاں

سر سیّد احمد خاں کا شمار بہت بڑے لوگوں میں ہے۔ وہ اپنی قوم کے بڑے مُصلح اور مُحسن تھے۔ یوں تو اُن کا احسان تمام ہندُستان پر ہے لیکن ہندُستان کے مسلمانوں پر اُن کے اس قدر احسانات ہیں کہ اُن کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔

سیّد احمد خاں دِلّی کے رہنے والے تھے اور وہیں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ اِن کے بزرگ ہندُستان میں شاہ جہاں کے وقت آئے اور اُس وقت سے آخر تک ان کے خاندان کا تعلق مُغلیہ سلطنت اور مُغلیہ بادشاہوں سے رہا۔

سیّد صاحب کے والد میر مُتقی ایک آزاد مَنِش شخص تھے۔ اس لیے بچپن میں سیّد صاحب کی ابتدائی تعلیم اور تربیت کی تمام نگرانی اِن کی [illegible] نے کی۔ ان کی والدہ اگرچہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں لیکن بڑی مُنتظِم، نیک دِل اور روشن خیال بی بی تھیں۔ وہ اپنی آمدنی کا ایک حِصّہ غریبوں اور بے کس عورتوں کی مد میں صرف کرتیں، نوکروں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتیں تعویذ گنڈے اور توہمات

پر بالکل اعتقاد نہ تھا۔ سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین صاحبِ علم و فضل تھے اور خاص کر علمِ ریاضی میں بڑا کمال حاصل تھا

والدہ سے اُنھوں نے صرف قرآنِ مجید اور فارسی کی ابتدائی دو چار کتابیں پڑھی تھیں۔ اس کے بعد دوسرے اساتذہ سے فارسی اور عربی کی تحصیل کی اور ریاضی اور طب میں بھی مہارت پیدا کی۔ جب اُنھوں نے پڑھنا چھوڑا تو اُن کی عُمر اٹھارہ اُنیس برس کی تھی۔ اس کے بعد خود ہی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے اور دلّی میں جو نامور اہلِ علم اور فارسی داں تھے جیسے صہبائی، غالب، آزردہ وغیرہ اُن کی صحبت سے فایدہ اُٹھاتے رہے۔ ملازمت کے بعد اُنھوں نے اپنا علم پھر تازہ کیا اور بعض نامور اساتذہ سے عربی ادب اور حدیث کی سند حاصل کی۔

جب سرسیّد کے والد کا انتقال ہُوا تو اُن کی عُمر کُچھ کم بائیس سال کی تھی۔ قلعے کی آمدنی میں سے کچھ تو سرسید کی والدہ کے نام جاری رہی، باقی سب تنخواہیں بند ہوگئیں۔ اس لیے اب انھیں سرکار انگریزی کی مُلازمت کا خیال ہُوا اور اُنھوں نے کچہری میں اُمیدواری کرنی شرُوع کی۔ چند مہینے کام سیکھنے کے بعد وہ عدالت کے سررشتہ دار

ہوگئے۔ اُس زمانے میں اُنھوں نے قوانینِ دیوانی کا خلاصہ تیار کیا جس کے صلے میں ان کے لیے منصفی کی سفارش کی گئی امتحان منصفی میں بھی وہ کامیاب ہوگئے اور تھوڑے ہی دِنوں بعد منصفی کے عہدے پر مقرر کردیے گئے۔ تالیف و تصنیف کا اُنھیں بہُت شوق تھا۔ پہلے تو بعض قانونی کتابیں تالیف کیں اور پھر کئی مذہبی رِسالے لکھے اور ایک عربی رسالہ فارسی میں ترجمہ کیا۔

اسی زمانے میں سرسید کو بادشاہ نے جوادُ الدولہ سیّد احمد خاں عارف جنگ کا خطاب عطا فرمایا۔

دِلّی میں جب وہ منصف تھے اُنھوں نے ایک ایسا اچھا کام کیا جو علمی دُنیا میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ آثارُ الصنادید کی تصنیف تھی۔ اس کتاب میں دِلّی کی قدیم عمارتوں کے حالات، ان کے کتبوں کی نقل اور عمارتوں کے نقشے۔ دہلی کے مشہور اور نامور لوگوں کے حالات لکھے ہیں۔ اس کتاب کی تالیف میں اُنھیں بڑی محنت اور مشقت اُٹھانی پڑی۔ یورپ میں اس کتاب کی بڑی قدر ہوئی۔ اُسی زمانے میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوا اور اِنگلستان کی نامور علمی انجمن رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسیّد کو اپنا رُکن مقرر کیا۔

سر سیّد کو تالیف و تصنیف کا شوق شروع ہی سے تھا، چنانچہ جب وہ دِلّی سے بجنور تبدیل ہو کر گئے تو بجنور کی تاریخ لکھ ڈالی۔ تاریخ بجنور کے بعد آئین اکبری کی تصحیح کا کام شروع کیا۔ یہ شہنشاہ اکبر کے فاضل وزیر ابُوالفضل کی تصنیف ہے اور نہایت لاجواب کتاب ہے۔ اس کی تصحیح سر سید نے بڑی محنت اور کوشش سے کی۔ پہلی اور تیسری جلد تو چھپ گئی لیکن دُوسری ابھی چھپنے نہ پائی تھی کہ غدر ہو گیا۔

غدر کا زمانہ قیامت کا زمانہ تھا۔ سر سیّد اُس زمانے میں بجنور میں تھے اور اُس ضلع کا تمام نظم و نسق اُن کے ہاتھ میں تھا۔ اگرچہ وہاں کے ہندو مسلمانوں نے اپنی خانہ جنگیوں سے طوفان مچا رکھا تھا اور خود سر سید کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے مگر غدر کے بعد محض سر سیّد کی بدولت یہ ضلع تمام سزاؤں اور آفتوں سے محفوظ رہا۔ باغیوں کی تحقیقات کے لیے جو کمیشن مقرر ہُوا تھا اُس میں صرف یہی ایک ہندُستانی ممبر تھے۔ اُنھوں نے معصوم اور بے خطا لوگوں کی بڑی دلیری سے حمایت کی اور بیسیوں کو پھانسی سے بچا لیا۔

۱۸۶۰ء میں بہت سخت قحط پڑا۔ سر سیّد نے مُرادآباد


SAMI.40

میں ایسا اچھا انتظام کیا کہ حکومت اور رعایا دونوں اُن کی بے حد تعریف کرتے تھے۔

مُرادآباد ہی میں سرسیّد نے ضیاءِ برنی کی مشہور اور مُستند تاریخ "تاریخِ فیروز شاہی" کی تصحیح مختلف نسخوں سے کی اور اُسے ایشیاٹِک سوسائٹی بنگال نے طبع کرایا۔

اس کے بعد مُرادآباد سے سرسید کی تبدیلی غازی پوُر ہوئی۔ وہاں اُن کو یہ خیال ہوُا کہ جب تک ہندُستان میں عِلم کی عام اشاعت نہ ہوگی یہ مُلک کبھی ترقّی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اِس خیال سے اُنھوں نے سائنٹفک سوسائٹی قایم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ترجموں کے ذریعے سے جدید علوم کی اِشاعت مُلک میں کی جائے۔

غازی پوُر کے قیام کے زمانے میں سرسید نے ایک مدرسہ قایم کیا جو اب تک ہی اور اُس میں فوقانیہ درجے تک تعلیم ہوتی ہی۔

جب ۱۸۶۴ء میں سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہوُا تو سائنٹفک سوسائٹی بھی علی گڑھ میں منتقل ہوگئی۔ اس سوسائٹی نے سائنس اور تاریخ وغیرہ کی بہُت سی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس کی عِمارت اب تک علی گڑھ میں موجود ہی۔ سائنٹفک سوسائٹی سے اُنھوں نے ایک اخبار

بھی "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے نکالا جو سر سید کے بعد بھی جاری رہا۔ اس میں بڑے اچھے اچھے مضامین شایع ہوتے تھے۔ اس اخبار نے اہل مُلک کو صحیح اخبار نویسی کا سبق دیا۔

سر سیّد نے گورنمنٹ میں ایک یہ تحریک بھی پیش کی تھی کہ علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں بھی دی جائے اور اس کے لیے ایک الگ جامعہ قایم کی جائے، کیوں کہ بغیر اس کے مُلک میں عام تعلیم اور روشن خیالی نہیں پھیل سکتی۔ لیکن گورنمنٹ کی طرف سے سرپرستی نہ ہونے سے یہ تجویز یوں ہی رہ گئی۔

سر سید نے انگلستان کا بھی سفر کیا اور وہاں کی نامور اور معزز تعلیم گاہوں اور جامعات کو بغور دیکھا اور وہیں سے اپنے مُلک میں ایسی درسگاہیں قایم کرنے کا ڈول ڈالا۔

انگلستان سے واپس آنے کے بعد سر سید کا سب سے پہلا اور بڑا کام یہ تھا کہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ اس رسالے کا نکلنا تھا کہ چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ "تہذیب الاخلاق" نے خیالات میں نیز اُردو تحریر میں بڑا انقلاب پیدا کیا۔ اس کے مضامین ایسی شُستہ عبارت اور معقول پیرائے میں لکھے جاتے تھے

کہ باوجود مخالفت کے اس نے خیالات کے بدلنے اور اُردو تحریر کی ترقّی میں بڑا کام کیا۔ لیکن سر سیّد احمد خاں کا سب سے بڑا اور بے مثل کام مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کا قایم کرنا تھا۔ اگرچہ لوگوں نے بہت مخالفت کی مگر وہ بڑے اِستقلال سے اپنے خیال پر جمے رہے اور اپنے منصوبوں کو کامیاب کرکے دکھایا۔ آج وہ کالج "مسلم یونیورسٹی" ہوگیا ہی اور سر سیّد کی بے لاگ کوششوں کا سب سے بڑا ثبوت ہی۔

کالج کے قیام کے بعد سر سیّد نے ملازمت سے قطع تعلق کرلیا اور آخر دم تک علی گڑھ ہی میں رہے۔

اُن کا دُوسرا بڑا کام "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" ہی اس کانفرنس نے مسلمانوں میں تعلیم کا شوق پیدا کیا اور اُن کے دلوں میں علم کے حصول اور آگے بڑھنے کا ولولہ پیدا کیا۔ اس نامور بزرگ اور محسن کا انتقال اسّی برس کی عمر میں ۱۸۹۸ء میں ہوا۔

سر سیّد کی بے نفس اور بے لاگ کوششوں، اُن کی قومی ہمدردی اور ایثار، اُن کی عالی ظرفی اور عالی ہمتی کو دیکھ کر دُشمن بھی قایل ہوگئے۔ گورنمنٹ نے بھی اُن کی بڑی قدر کی، وائسرائے کی کونسل کا ممبر بنایا، اعلیٰ خطابات

عطا کیے اور ان کی رایوں کی قدر و منزلت کی۔

سوالات

۱۔ معنے بتاؤ:۔ مُصلح، آزادمنش، توہّمات، حدیث، تالیف، تصنیف
تحصیل، آثار الصنادید، جامعہ، اساتذہ، قوانین، تصحیح، کمیشن، مُستند

۲۔ تشریح کرو:۔ "تہذیب الاخلاق نے خیالات میں نیز اُردو تحریر میں
بڑا انقلاب پیدا کیا۔ اس کے مضامین شُستہ عبارت اور معقول پیرائے
میں لکھے جاتے تھے۔"

"سرسیّد کی بےنفس اور بےلاگ کوششوں اُن کی قومی ہمدردی
اور ایثار، اُن کی عالی ظرفی اور عالی ہمتی کو دیکھ کر دشمن بھی قایل ہوگئے۔"

۳۔ "تازہ کرنا، جان کے لالے پڑجانا، ڈول ڈالنا، اشاعت کرنا اور قیامت
کا زمانہ"۔کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

۴۔ غالبؔ، آزردہ، صہبائی، شاہ جہاں، سلطنت مُغلیہ، ابوالفضل،
شہنشاہِ اکبر، ضیائے برنی، تاریخ فیروز شاہی، آئینِ اکبری، رائل
ایشیاٹک سوسائٹی۔ یہ سب کون اور کیا ہیں؟

۵۔ سرسیّد کی زندگی پر کس کا اثر پڑا؟ یہ اثر کس قسم کا تھا اور اُن کی
تعلیم کس طرح ہوئی؟

۶۔ سرسیّد کو سرکار انگریزی کی ملازمت کا خیال کیوں پیدا ہوا۔اُن کی

ملازمت اور غدر اور مراد آباد کے قیام کے زمانے کی خدمات کا مختصر حال بیان کرو۔

۷۔ سرسید کا بے مثل کام کیا تھا؟ اس پر مختصر نوٹ لکھو

۸۔ سائنٹفک سوسائٹی کب قایم ہوئی اور اس نے کیا کام انجام دیا؟

۹۔ سرسید نے انگلستان سے واپسی کے بعد کون سے بڑے بڑے کام کیے؟

۱۰۔ بڑے آدمی کی کیا پہچان ہے؟ کیا ہم سرسید کو بڑا آدمی کہہ سکتے ہیں.

۱۱۔ اِن جُملوں کی تصحیح کرو:۔

۱۔ سید صاحب کی ابتدائی تعلیم کی نگرانی ان کی والدہ کیں۔

۲۔ انھوں والدہ سے فارسی کی ابتدائی ابتدائی دو چار کتابیں پڑھے

۳۔ وہ جمود کو توڑا اور غفلت سے جگایا۔

۴۔ لوگ بہت مخالفت کیے مگر انھوں اپنے خیال پر جمے رہے اور اپنے منصوبوں کو کامیاب کر کے دکھا دیے۔

۱۲۔ صاحبِ علم اور اہلِ علم کے کیا معنے ہیں۔ اس قسم کے پانچ سات الفاظ بتاؤ جن کا پہلا جزو 'صاحب' یا 'اہل' ہو۔

مور



کیا مور ہی بنایا پروردگار تو نے
بخشے ہیں اُس کو کیا کیا نقش و نگار تو نے

گویا کہ بال و پر میں گلزار کھِل رہا ہی
جو بیل ہی نرالی، بوٹا جو ہی نیا ہی

یہ پھول ہیں شگفتہ، تن پر جو داغ سے ہیں
چُن کر یہاں لگائے، قدرت نے باغ سے ہیں

یہ تاج اُس کے سر پر کیسا ہی یا الٰہی!
بخشی ہی تو نے اُس کو گلشن کی بادشاہی

جھم جھم برس چکا ہو، سبزہ پہ جب کہ پانی
ہوتی ہی اُس کے دل کو اُس وقت شادمانی
دل شاد ہو کے بولی، تب اپنی بولتا ہی
پر ناچنے کی خاطر، اس وقت کھولتا ہی
دُم کو چنور بنا کر، ہر ناچتا خوشی سے
ہی اپنے دوستوں کو، دیتا صدا خوشی سے
جس وقت باری باری ہیں ناچنے پہ آتے
جنگل میں مِل مِلا کر، منگل ہیں پھر مناتے

سوالات

۱۔ نقش و نگار، بُوٹا، چنور اور جنگل میں منگل منانا کے معنے بتاؤ اور اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

۲۔ مور کو گلزار کیوں کہا گیا ہی۔

۳۔ بارش کے بعد مور کی حالت میں کیا تبدیلی ہو جاتی ہی۔

۴۔ فعل امدادی سے کیا مُراد ہی، کوئی مثال دے کر واضح کرو۔

۵۔ اس نظم میں دو تین ایسے جملے تلاش کرو جن میں مبتدا، خبر اور فعل ناقص پائے جاتے ہوں۔

وقت سرمایہ ہے

۱۔ یہ وہ سرمایہ ہے جو ہر شخص کو قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ جو لوگ اس سرمایے کو معقول طور سے کام میں لاتے ہیں وہی عیشِ جسمانی اور مسرتِ روحانی حاصل کرتے ہیں۔ اسی کی بدولت ایک وحشی آدمی مہذب انسان اور مہذب انسان فرشتہ سیرت بن سکتا ہے اسی کی برکت سے جاہل، عالم اور مفلس، تونگر اور نادان، تجربہ کار ہو سکتا ہے اطمینان، خوشی اور آرام انسان کو ہرگز میسر نہیں ہوتا جب تک وہ مناسب طریقے سے صرفِ اوقات نہیں کرتا۔

۲۔ وقت بے شک ایک دولت ہے جو کوئی اس دولت کو بے اندازہ و بے حساب خرچ کرتا ہے وہ روز بروز بے نوا اور تہی دست ہوتا جاتا ہے۔ وہ جب تک زندہ رہتا ہے ہمیشہ رنجیدہ و پریشان اور زمانے کا شاکی رہتا ہے۔ موت بھی اس کو اس پشیمانی اور اندوہ سے نہیں چھڑا سکتی بلکہ اس کے حق میں موت کا آنا گویا مجرم کے لیے گرفتاری کا پروانہ ہے۔

۳۔ سچ یہ ہے کہ وقت ضایع کرنا بھی ایک طرح کی

خودکشی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ خودکشی ہمیشہ کے لیے زندگی سے محروم کر دیتی ہے اور تضیع اوقات ایک محدود زمانے تک زندے کو مُردہ بناتی ہے۔ یہی منٹ، گھنٹے اور دن جو غفلت اور بے کاری میں گزر جاتے ہیں، اگر آدمی حساب کرے تو اُن کی مقدار مہینوں بلکہ برسوں تک پہنچتی ہے۔ اگر اُس سے کہا جاتا کہ تیری عُمر سے دس پانچ برس کم کر دیے گئے تو یقیناً اُس کو سخت صدمہ ہوتا۔ لیکن وہ خود معطّل بیٹھا ہُوا اپنی عُمرِ عزیز کو برباد کر رہا ہے اور اُس کے زوال و فنا پر کچھ افسوس نہیں کرتا۔

۴۔ اگرچہ وقت کا بے کار کھونا عمر کا کم کرنا ہے، مگر ایک یہی نقصان ہوتا تو بھی چنداں غم نہ تھا کیونکہ دُنیا میں سب کو عُمرِ طویل نصیب نہیں ہوتی۔ لیکن بہت بڑا زیان اور خسارہ جو بے کاری اور وقت ضائع کرنے سے ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بے کار آدمی کے خیالات ناپاک اور خراب ہو جاتے ہیں۔ طمع، حرص، ظلم، حق تلفی، نافرمانی اکثر وہی اشخاص کرتے ہیں جو معطّل اور بے کار رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کچھ نہ کچھ کرنے کے واسطے بنایا گیا ہے۔ جب اُس کی طبیعت اور اُس کا دل و دماغ نیک اور مُفید کام میں مشغول نہیں ہوتا تو اُس کا میلان بدی کی طرف

ہو جاتا ہے۔ پس اگر آدمی آدمی بننا چاہتا ہے تو سب کاموں سے مقدم کام اُس کے واسطے یہ ہے کہ اپنے وقت کا نگراں رہے۔ ایک لمحہ فضول نہ کھوئے، ہر کام کے لیے ایک وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام مقرر کرے۔

۵- جو لوگ وقت کے پابند ہوتے ہیں وہ اپنے کام کو تن دہی اور چُستی سے کرتے ہیں۔ اُن کو کام کے انجام دینے کا خیال لگا رہتا ہے۔ کسی دوسرے کے تقاضے اور تاکید کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ خود اُن کی طبیعت اُن کو مجبور کرتی ہے کہ عین وقت پر اور مقررہ مہلت کے اندر کام سے فراغت حاصل کرو۔ یہ چُستی اُن کی خصلت اور عادت بن جاتی ہے اور بغیر اس طریقۂ کارگزاری کے اُن کو چین ہی نہیں آتا۔ جب عین وقت پر کام کر لینے کی عادت پڑ جاتی ہے تو وقت میں بڑی وسعت و برکت معلوم ہوتی ہے اور ایک کام ختم کرنے کے بعد دوسرا کام کرنے کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ ایسا شخص بہت سے کام انجام دے چکتا ہے پھر بھی اُس کو سیر و تفریح کے لیے، خواب و آرام کے لیے دوستوں کی ملاقات کے لیے فرصت مل جاتی ہے۔ برخلاف اُس کے جو آدمی وقت کے پابند نہیں ہوتے وہ کام کرنے میں سُستی اور کاہلی کرتے ہیں اور اس خراب عادت کی

وجہ سے وقت گزر جاتا ہے اور کام بدستور باقی رہتا ہے۔ اور جب کام کرتے ہیں تو اُن کو اپنا وقت کم اور کام زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اکثر تنگیٔ وقت سے نالاں رہتے اور عدیم الفرصتی کا گِلہ کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے اپنے وقت کو کاٹ چھانٹ کر کے تنگ بنا لیتے ہیں۔

۶۔ مشغلے اور محنت میں خُدا نے ایک یہ بھی برکت رکھی ہے کہ محنتی آدمی کے خیالات میں ہمیشہ نکوئی اور صلاحیت بڑھتی جاتی ہے۔ وہ قانع، سخی، مُنصف، دیانت دار شُکرگزار اور باادب ہوتا ہے۔ وہ اپنے اوقات کو بھی عزیز رکھتا ہے اور دُوسروں کے اوقات میں خلل انداز نہیں ہوتا۔ اگر وہ کسی سے وقتِ مُعیّن کا وعدہ کر لیتا ہے تو اُس وعدے کو وفا بھی کرتا ہے۔ وہ دُوسروں کو انتظار کی تکلیف بھی تا بمقدُور نہیں ڈالتا۔

اب بے کاروں اور کاہلوں کے حالات پر غور کرو تو مُعاملہ برعکس نظر آتا ہے۔ نہ وہ اپنے وقت کی قدر کرتے ہیں نہ دوسروں کے وقت کی۔ اُن کے نزدیک وقت پر کام کرنا یا وعدہ وفا کرنا کوئی چیز نہیں۔ وہ ریل پر سفر کرتے ہیں تو ایسے وقت اسٹیشن پہنچتے ہیں جب روانگی

کی سیٹی ہو چکتی ہے۔ اگر ریلوے کے قواعد میں اُن لوگوں کی رعایت بھی کی جاتی جو وقت کے پابند نہیں ہیں تو یہی ریل گاڑی جو گھنٹے میں تیس چالیس میل طے کرتی ہے چھکڑے سے بدتر ہو جاتی۔ میں نے معتبر ذریعے سے سُنا ہے کہ ہمارے ایک ہندوستانی امیرزادے کو ریل کی سواری محض اس وجہ سے ناپسند تھی کہ اُس میں وقت کی پابندی بہت ہے۔

سوالات

۱۔ ان لفظوں کے معنے بتاؤ:۔

تہی دست، بے نوا، تضیع اوقات، زیان، تن دہی، قانع، عدیم الفرصت، مُقدم، نکوئی، تونگر۔

۲۔ شاکی، اندوہ، معطل، میلان، وعدہ وفا کرنا، حق تلفی اور تا بمقدور کو جملوں میں استعمال کرو۔

۳۔ مطلب بیان کرو:۔

ا۔ اس کے حق میں موت کا آنا گویا مجرم کے لیے گرفتاری کا پروانہ ہے۔

ب۔ وقت ضائع کرنا بھی ایک طرح کی خودکشی ہے۔

ج۔ اسی کی بدولت ایک وحشی آدمی مہذب انسان اور ایک

مہذب انسان فرشتہ سیرت بن سکتا ہی۔

۴۔ وقت ضایع کرنے کے کیا نقصانات ہیں ؟

۵۔ وقت کو دولت کیوں کہتے ہیں ؟

۶۔ پابندیِ اوقات کے فایدے بیان کرو۔

۷۔ ان جملوں میں فعل معروف اور فعل مجہول کی شناخت کرو۔

(۱) وہ اپنی عمر کو برباد کر رہا ہی۔ (۲) انسان کو کچھ نہ کچھ کرنے کے واسطے بنایا گیا ہی۔ (۳) اُن لوگوں کی رعایت کی جاتی ہی۔ (۴) وہ اس دولت کو بے اندازہ خرچ کرتا ہی۔ (۵) وہ مرنے کے بعد حسرت و اندوہ میں مبتلا رہے گا۔

۸۔ ان مصدروں سے فعل ماضی مطلق مجہول اور فعل حال مجہول بنا کر گردان کرو :-

لانا ، دینا ، بنانا ۔

کچھوا اور خرگوش

ایک کچھوے کے آگئی جی میں — کیجیے سیر و گشت خشکی میں
جا رہا تھا چلا ہوا خاموش — اُس سے ناحق اُلجھ پڑا خرگوش
میاں کچھوے تمھاری چال ہے یہ — یا کوئی شامت اور وبال ہے یہ
کیوں ہوئے چل کے مُفت میں بدنام — بے چلے کیا اٹک رہا تھا کام
تم کو یہ حوصلہ نہ کرنا تھا — چلّو پانی میں ڈوب مرنا تھا

یہ تن و توش اور یہ رفتار
ایسی رفتار پر خدا کی مار

بولا کچھوا کہ ہوں خفا نہ حضور — میں تو ہوں آپ مُعترف بہ قصور
اگر آہستگی ہے جرم و گناہ — تو میں خود اپنے جرم کا ہوں گواہ
مجھ کو جو سخت و سُست فرمایا — آپ نے سب دُرست فرمایا
مجھ کو غافل مگر نہ جانیے گا — بندہ پرور بُرا نہ مانیے گا
یوں زبانی جواب تو کیا دوں — شرط بد کر چلو تو بتلا دوں

تم تو ہو آفتاب میں ذرّہ
پر ہٹا دوں گا آپ کا غرّہ

سُن کے خرگوش نے یہ تلخ جواب — کہا کچھوے سے یوں ز روئے عتاب
تو کرے میری ہمسری کا خیال — تیری یہ تاب یہ سکت یہ مجال

چیونٹی کے جو پر نکل آئے　　تو یقین ہے کہ اب اجل آئے

ارے بے باک بدزباں منہ پھٹ　　تو نے دیکھی کہاں ہے دوڑ جھپٹ

جب میں تیزی سے جست کرتا ہوں　　شہسواروں کو پست کرتا ہوں

گرد کو میری باد پا نہ لگے　　لاکھ دوڑے مرا پتہ نہ لگے

ریل ہوں برق ہوں چھلاوا ہوں　　ہیں چھلاوے کا بلکہ باوا ہوں

تیری میری نبھے گی صحبت کیا　　آسماں کو زمیں سے نسبت کیا

جس نے جھکتے ہیں ترکی و تازی　　ایسے مریل سے کیا بدے بازی

بات کو اب زیادہ کیوں دوں طول　　خیر کرتا ہوں تیری شرط قبول

ہے مناسب کہ امتحاں ہو جائے　　تاکہ عیب و ہنر عیاں ہو جائے

الغرض اک مقام ٹھہرا کر
ہوئے دونوں حریف گرم سفر

بس کہ زوروں پہ تھا چڑھا خرگوش　　تیزی پھرتی سے یوں بڑھا خرگوش

جس طرح جائے توپ کا گولا　　یا گرے آسمان سے اولا

ایک دو کھیت چوکڑی بھر کے　　اپنی چستی پہ آفریں کر کے

کسی گوشے میں سو گیا جا کر　　فکر کیا ہے چلیں گے سستا کر

اور کچھوا غریب آہستہ　　چلا سینے کو خاک پر گھستا

سوئی گھنٹے کی جیسے چلتی ہے　　یا بتدریج چھاؤں ڈھلتی ہے

یوں ہی چلتا رہا باستقلال　　نہ کیا کچھ ادھر ادھر کا خیال

کام کرتا رہا جو پے در پے　　کر گیا رفتہ رفتہ منزل طے

حیف خرگوش رہ گیا سوتا | ثمرہ غفلت کا اور کیا ہوتا
جب کھلی آنکھ تو سویرا تھا | سخت شرمندگی نے گھیرا تھا
صبر و محنت میں ہی سرافرازی | سُست کچھوے نے جیت لی بازی
نہیں قصہ یہ دل لگی کے لیے | بلکہ عبرت ہی آدمی کے لیے

ہی سخن اس حجاب میں روپوش
ورنہ کچھوا کہاں، کہاں خرگوش

سوالات

۱۔ وبال، معترف، قصور، سخت سست کہنا، زردوئے عتاب، چھلاوا، حریف، چوکڑی بھرنا، آفریں، حیف اور بادپا کے معنے بتاؤ۔

۲۔ مطلب بیان کرو۔

سوئی گھنٹے کی جیسے چلتی ہی۔
یا بتدریج چھانو ڈھلتی ہی
جس نے بھگتے ہوں ترکی و تازی
ایسے مریل سے کیا بدے بازی
ہی سخن اس حجاب میں روپوش
ورنہ کچھوا کہاں، کہاں خرگوش

۳۔ اس قصے کو اپنے لفظوں میں بیان کرو اور بتاؤ کہ اس سے تم نے

کیا سبق سیکھا۔

۴۔ تن و توش، سکت، غرہ، ثمرہ، پے در پے اور سرافرازی کو جملوں میں استعمال کرو۔

۵۔ ان مصرعوں کی تصحیح کرو۔

تم نے یہ حوصلہ نہ کرنا تھا
آسماں نے زمیں سے نسبت کیا
میرے کو جو سخت و سست فرمایا
گردنے میری باد پا نہ لگے
میرے کو غافل مگر نہ جانیے گا

کشتی اور بحرِ ناپیداکنار

بڑی خیریت یہ گزری کہ ہیری کو وہ ننھا سا غار بہت اچھی طرح یاد تھا جس میں خزانہ رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ زین کے دو تھیلے نکال لینے میں زیادہ وقت نہ صرف ہوا۔

ریوا پہلے ہی سے کشتی میں پہنچ چکی تھی۔ اب ہم دونوں بھی ایک ایک تھیلا اُٹھا، جلدی جلدی ساحل کے ساتھ ساتھ روانہ ہوئے۔

میں نے بڑی پریشانی کے عالم میں کہا "جلدی چلو۔ ہیری جلدی چلو، جب تک ہم سمندر میں دُور نہ نکل جائیں تب تک اپنے آپ کو خطرے سے دُور نہ سمجھنا چاہیے"۔

میرے ساتھی نے پوچھا "کیا بات ہے ڈک؟ کس بات سے ڈر رہے ہو؟"

جواب دینے کی کچھ ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ میں بڑی دیر سے آہٹ لے رہا تھا اور سمجھے بیٹھا تھا کہ جہاں کوئی آواز آئی اُس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہمارے فرار کا راز طشت از بام ہوگیا۔ اب ایک بلند اور ایسی وحشیانہ چیخ سُنائی دی جس سے بہادروں کے دل بھی دہل

جاتے۔ ساتھ ہی کھجور کے درختوں کے جھنڈ میں سے بیس
پچیس سیاہ فام وحشی باہر نکل آئے جو بڑی تیزی سے بھاگتے
ہوئے ہماری طرف آرہے تھے۔میں نے اپنے ساتھی کو
پھر تیز تیز چلنے کی تاکید کی۔

میں نے کہا" وہ ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔ہم پکڑے
گئے تو بس قصہ ہی تمام ہے"۔

ہیری نے مُنہ سے کچھ نہ کہا، صرف سر ہلا دیا۔اب
ہم دونوں پہلو بہ پہلو وہ ہیبت ناک دوڑ دوڑ رہے تھے
جس میں ہارنے کے معنی فوری اور ظالمانہ موت تھے۔
اب تھوڑا سا ہی فاصلہ باقی رہ گیا تھا لیکن اہلِ جزیرہ سب
کے سب بڑے پھرتیلے، مستعد اور تنومند تھے۔مزید براں
سردار کی خوشنودی حاصل کرنے کی اُمید نے اُن کے
پر لگا دیے تھے۔میں نے لئیکا کی آواز سُنی اور گو اس
کے الفاظ میری سمجھ میں نہ آئے مگر میں اس کا مطلب
سمجھ گیا کہ وہ کبھی تو اپنے ساتھیوں کی ہمت بڑھاتا ہے
اور کبھی شور مچا مچا کر ہمیں دھمکاتا ہے۔ہم اب تک اُڑے
ہوئے جا رہے تھے مگر اس دوڑ دھوپ نے ہمارا بُرا
حال کر دیا تھا۔میرے گلے کا یہ حال تھا کہ جیسے کانٹے
چُبھ رہے ہوں، ناک سے خون بہ رہا تھا، آنکھوں میں

اِس شِدّت کا درد ہو رہا تھا کہ زمین تک مشکل سے سُجھائی دیتی تھی۔ آدھا فاصلہ بھی طے کرنے نہ پائے ہوں گے کہ ہیری نے مجھے تیز دوڑنے پر اُکسانا شروع کیا۔

یک لخت وہ چلّایا "آہاہا، وہ رہی کشتی۔ بس تین منٹ کی اور بات ہی پھر اپنے آپ کو سلامت سمجھو"

لیکن کیا اور تین منٹ تک بھاگتے رہنا ممکن تھا؟ مجھے تو اُمید نہ تھی۔ تاہم اس کے ساتھ ہی اِرادہ کر لیا کہ ایک دفعہ پورے زور سے کوشش کیے بغیر نہ مانوں گا۔

مونولو کشتی کے بادبان دُرست کرنے میں مشغول تھا۔ ریوا کشتی کے اندر کھڑی اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر اِشارے کر رہی تھی۔ "ہیری جلدی! ڈک جلدی! اور تیز! اور تیز!"

اب میں لڑکھڑا رہا تھا، میرے پانْو کانپ رہے تھے تھیلے کا بوجھ مجھے کچلے دے رہا تھا۔ اگر شرم دامن گیر نہ ہوتی تو میں کبھی کا اس کش مکش کو ترک کر چکا ہوتا۔ ہماری مصیبتوں میں ایک نیا اضافہ یہ ہُوا کہ دفعتًہ بندوق چھوٹنے کی آواز آئی اور گولی سن سے ہمارے سروں پر سے گزر گئی۔

ہیری نے پُر معنی انداز میں کہا۔ "لیکا!" اور میں سمجھ گیا کہ جزیرے کا سردار چاہتا ہے کہ زندہ یا مردہ جس طرح

ممکن ہو ہمیں حاصل کرے۔ لیکن ہم اب عین کنارے پر پہنچ چکے تھے اور ہمارے پانو پانی میں تھے۔ پہنچتے ہی ہم نے تھیلے کشتی میں ڈال دیے اور کشتی آگے کو دھکیل کر جھٹ سوار ہوگئے۔

ہیری نے اپنے ہاتھ ہلائے اور چلّا چلّا کر کہا "آہا ہا ہا! خدا حافظ لئیکا!"

اس اثنا میں وحشیوں نے کئی ٹولیاں بنالی تھیں۔ اور کچھ تو اپنی کشتیاں لینے کو بھاگے جا رہے تھے۔ جو اس مقام سے دو تین میل کے فاصلے پر تھیں اور کچھ اپنے سردار کے ساتھ ساتھ تھے اور سردار چلّا چلّا کر ہمیں واپس آنے کو کہہ رہا تھا۔

اتنی دیر میں ہیری نے چپّو سنبھال لیا تھا۔ ہونولو نے بادبان درست کردیا تھا اور ہماری کشتی چلنی شروع ہوگئی تھی۔ اتنے میں بندوق کی ایک اور آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی ایک چیخ سنائی دی۔ یہ دیکھ کر ہمیں بے حد صدمہ اور پریشانی ہوئی کہ ہمارے وحشی رہنما نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے اور دھڑام سے کشتی میں گر پڑا۔

یک لخت اودھم سا مچ گیا۔ آدھی درجن حبشیوں نے

خوشی کے نعرے لگائے اور ہماری طرف بڑھے۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہماری تمام کوششیں رائگاں گئیں۔ لیکن ہیری ہمت نہ ہارا۔ مجھے تو بادبانوں کا خیال رکھنے کو کہا اور خود مونولو کی بندوق اٹھالی اور لیڈیا پر نشانہ باندھ کر گھوڑا دبا دیا۔

نشانہ چوک گیا اور فوراً اہلِ جزیرہ وحشیانہ نعرے لگاتے ہوئے بے دھڑک پانی میں کود پڑے اور ہماری کشتی کی طرف بڑھنے لگے۔

یہ بڑا خطرناک وقت تھا۔ مونولو بے بسی کی حالت میں پڑا تھا اور دیوا اس پر جھکی ہوئی تھی۔ مگر وہ یک لخت اُٹھی اور بادباں کو سنبھالنے کے لیے آپہنچی۔ میں نے چپّو اُٹھالیا اور کشتی کے اگلے حصّے میں ایک وار سے اُس وحشی کی تواضع کی جو سب سے آگے آگے تھا۔ وہ بے ہوش ہوکر پانی میں گر پڑا اور اُس کا ایک ساتھی اُسے گھسیٹ کر کنارے پر لے گیا، اس سے وہ ذرا ہی سی دیر ٹھٹکے اور پھر کوئی آدھی درجن حبشی جنگ جُو مگدر سنبھالے ہماری طرف بڑھے۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ یہ جد و جہد اب ختم ہونے کو ہے اور اس کا انجام ہماری گرفتاری یا موت ہوگا۔

ہیری بندوق کو پھر بھرنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر ناکام رہا۔ اب اُس نے اُسے بھرنے کا خیال چھوڑ دیا اور اُسے نال کی طرف سے پکڑ لیا اور جو حملہ آور بھی آگے آتا اُس پر وار پہ وار کرنے لگا۔ اس سے دو تین حملہ آور چکرا کر پیچھے ہٹے اور لہولہان ہو کر کنارے پر پہنچے۔

لیکن ہمارا اصلی دشمن ایسا کچّا نہ تھا کہ دو لڑکوں سے شکست کھانا گوارا کر لیتا۔ اپنے ایک زخمی ساتھی کو ایک طرف ہٹا کر وہ بندوق سنبھالے آگے بڑھا۔ ہیری نے اُس پر وار کیا مگر نشانہ ٹھیک نہ بیٹھا۔ تاہم اُس کی کوشش رایگاں نہ گئی۔ سردار وار سے بچنے کے لیے مڑا ہی تھا کہ میرے ہتھے چڑھ گیا۔ میں نے تاک کر ایک چپّو اُس کی کنپٹی پر ایسا رسید کیا کہ پتھر کی طرح پانی کی تہ میں بیٹھ گیا۔

وحشیوں نے افراتفری کی حالت میں غُل مچانا شروع کر دیا۔ وہ اپنے بے ہوش سردار کے گرد جمع ہو گئے اور اُسے بحفاظت خشکی پر لے گئے۔

ہیری نے چلّا کر کہا "جلدی کرو، جلدی۔ یہی موقع بچ نکلنے کا ہے" اور اس سے پیشتر کہ وحشی پھر واپس آئیں ہم اپنی جان بچانے کو بڑی محنت سے کشتی کھینے لگے۔

ہم بڑھتے چلے جا رہے تھے مگر سارا بدن چور ہو گیا تھا اور چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہہ رہا تھا اور ہم درد کے مارے بے تاب تھے۔ پھر بھی ٹھہرنے کی جرأت نہ ہوئی کیونکہ ہم خوب جانتے تھے کہ کشتیاں ہمارے تعاقب میں روانہ ہو چکی ہوں گی۔ تاریکی نے ہمیں بڑی مدد پہنچائی۔ اور آخرکار چپو ہاتھ سے رکھ کر ہم آہٹ لینے لگے اور پانی میں جب اپنی کشتی کی آواز کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دی تو ہم پھر آزادی اور سلامتی کے خواب دیکھنے لگے۔

اب ہیری نے اپنی بہن کا ہاتھ بٹایا اور اس بہادر لڑکی نے مونولو کی مرہم پٹی کرنے میں مجھے مدد دی۔ بیچارہ بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اگرچہ اُسے انتہا درجے کا دُکھ ہو رہا ہوگا مگر مُنہ سے اُف تک نہ کرتا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے، گولی اُس کے پھیپھڑوں میں لگی تھی اور اب ہمارا وفادار دوست فقط چند ہی گھنٹوں کا مہمان تھا۔

ہم اس کے سوا اور کیا کر سکتے تھے کہ اُسے پانی پلاتے رہیں اور اُس کی تپتی ہوئی پیشانی کو ٹھنڈا کرتے رہیں۔

ریوا نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ رحم دل لڑکی اندھیرے میں چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ کیسے نہ بہاتی۔ مونولو نہ صرف برسوں بڑی وفاداری سے ہماری خدمت کرتا رہا بلکہ اپنی جان بھی ہم پر قربان کردی۔

آخر جب رات کی تاریک گھڑیاں تمام ہوئیں اور سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو زخمی اپنی ہی زبان میں کچھ بولنے لگا۔ میں اس کی باتیں بالکل نہ سمجھ سکا اور وہ ایسی دھیمی آواز میں بول رہا تھا کہ ریوا کو بھی اس کی باتیں سمجھنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ آخر اس نے اس کا ہاتھ بڑے پیار سے آہستہ سے دبایا، ایک لمبی سرد آہ کھینچی اور خاموش ہوگیا۔ پھر اس کا چہرہ ایک نہایت دلآویز تبسّم سے چمک اٹھا اور عین اس وقت جب آفتاب کا آتشیں گولہ شہابی اُفق سے اُبھر رہا تھا ہماری جان بچانے والا ابدی راحت کی نیند میں غرق ہو گیا۔

ریوا نے ہچکی سے کہا "غریب چل بسا" اور بڑی احتیاط سے اُس کا منہ ڈھانپ دیا۔

خوب دن چڑھے ہم نے اس کی نعش کو سمندر

کے حوالے کر دیا۔ میں کہانی کے اس حصے کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ صرف اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ باوجود سخت تکلیف کے دونوں بہن بھائی اپنے غریب مگر بہادر دوست کی موت پر بہت دیر تک اشک بار رہے۔

"مونولو! لہروں کی آغوش میں آرام کرو۔ تم پر خدا کی رحمت ہو۔ تمھارا جسم سیاہ تھا مگر تمھارا دِل نورانی تھا۔ دُنیا کے بہت سے لوگ تمھاری اس شجاعت کے کارنامے کو کبھی اپنے دل سے محو نہ ہونے دیں گے۔"

اس وفادار دوست کی موت نے ہماری توجہ اپنے ذاتی خطرے سے ہٹالی تھی۔ یہ خطرہ کچھ کم نہ تھا۔ وسیع سمندر تھا اور ننھی سی کھلی کشتی۔ جس شخص کو رہنمائی کرنی تھی وہ مر چکا تھا۔ ہمیں صرف اتنا معلوم تھا کہ ہمارا راستہ جنوب مشرق کی طرف ہے لیکن اس کے سوا ہمیں اور کچھ معلوم نہ تھا۔

ہیری اور اس کی بہن کو اس خطرے کا پورا احساس نہ تھا۔ میں نے اپنا خوف ان پر ظاہر نہ کیا۔ ہماری ننھی سی کشتی بحرِ ناپیدا کنار میں جھکولے کھاتی چلی جارہی تھی اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُفق کو تک رہا تھا

اور یہ سوچ رہا تھا کہ ہماری قلیل غذا کتنے عرصے تک کام دے سکے گی۔

غرق ہونے کا تو اتنا ڈر نہ تھا کیونکہ سمندر ساکن تھا اور مطلع صاف، مگر اب خوف تھا تو یہ کہ سورج ہمارے سروں پر تیزی سے چمک رہا تھا اور ہمارا حلق خشک ہوا جا رہا تھا۔

شروع شروع میں تو مجھے گوارا نہ ہوا کہ اپنے ساتھیوں کو پانی پینے سے روکوں لیکن جب رفتہ رفتہ سورج ڈوب گیا اور نہ کوئی جہاز نظر آیا نہ زمین، تو میں نے انھیں سمجھا دیا کہ اب پانی کو انمول سمجھ کر صرف کرو۔

ہیری نے حیران ہو کر پوچھا "کیوں ابھی تو بہت سا پانی موجود ہے؟"

میں نے کہا "پھر بھی ہمیں احتیاط کرنی چاہیے"

اگرچہ میں نے کوشش تو کی تھی کہ اس معاملے کی اہمیت ظاہر نہ ہونے پائے لیکن ہیری کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ وہ تاڑ گیا ہے۔

سوالات

۱۔ طشت از بام ہوجانا، فام، تنومند، اثنا، گمدر، مطلع، بادبان، افراتفری اور سپیدۂ سحر کے معنے بتاؤ۔

۲۔ پرمعنی اور انمول کے کیا معنے ہیں۔ اس طرح کے اور تین چار لفظ بتاؤ جن کا پہلا جزو "ان" یا "پر" ہو۔

۳۔ مطلب بتاؤ:

"اُس کا چہرہ ایک نہایت دلاویز تبسّم سے چمک اُٹھا اور جب آفتاب کا آتشیں گولا شہابی اُفق میں سے اُبھر رہا تھا، ہماری جان بچانے والا ابدی راحت کی نیند میں غرق ہوگیا۔"

۴۔ غار سے کشتی تک پہنچنے میں ڈک اور ہیری کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے؟

۵۔ ڈک اور ہیری کو کشتی میں سوار ہوتے دیکھ کر لٹبکا اور اس کے ساتھیوں نے کیا کیا

۶۔ ان دونوں نے وحشیوں سے کس طرح اپنی حفاظت کی؟

۷۔ سونولو کی موت سے کون سا خطرہ پیدا ہوگیا تھا اور اس لیے ڈک نے کیا کیا؟

۸۔ مثبت جملوں کو منفی اور منفی جملوں کو مثبت بناؤ:

(۱) ہیری کو وہ غار بہت اچھی طرح یاد تھا چنانچہ کھیلے نکالنے

میں بہت زیادہ وقت صرف نہ ہوا

(۲) ہیری اور اس کی بہن کو خطرے کا پورا احساس نہ تھا، اور میں نے اپنا خوف ان پر ظاہر نہ کیا تھا۔

(۳) جب تک ہم سمندر میں دور تک نہ نکل جائیں تب تک اپنے آپ کو خطرے سے باہر نہ سمجھنا چاہیے۔

(۴) پانی میں اپنی کشتی کی آواز کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دی۔

۹ - دل ہلنا، شرم دامنگیر ہونا، رائیگاں جانا، ہتھے چڑھنا اور ہاتھ ٹانا کو جملوں میں استعمال کرو۔

لاڈلا بیٹا

لاڈلا بیٹا تھا اک ماں باپ کا
جان ماں کی اور ایماں باپ کا

دیکھ اُسے ہوتے تھے دونوں باغ باغ
تھا وہی لے دے کے اُس گھر کا چراغ

ہر طرح اُس کی رضا مقصود تھی
جان تک اُس کے لیے موجود تھی

پر نہ مکتب سے کتراتا تھا وہ
نام سے پڑھنے کے گھبراتا تھا وہ

تھی نہ پڑھنے کی نہ تھی ترغیب کچھ
گوشمالی تھی نہ تھی تادیب کچھ

جب ہوا وہ ناز پروردہ جواں
رنگ لائیں اُس کی بے پروائیاں

آ پڑا اُس کا وہی آخر کو رنگ
لاڈلے بیٹوں کا جو ہوتا ہے ڈھنگ

سامنا ماں باپ کا کرنے لگا
ہمسری کا اُن کی دم بھرنے لگا

حق تو اُن کے اس سے کیا ہوتے ادا
اور ناراض اُن کو وہ رکھنے لگا

تھیں ادائیں اُس کی اکثر ناپسند
کارگر اُس کو ملامت بھی نہ پند

جہل و نادانی کی تھیں طغیانیاں
رات دن کرتا تھا نافرمانیاں

اُس کو صحبت تھی تو تھی اغیار سے
اُس کی ملت تھی تو تھی انفار سے

خوف ہوتا تھا نصیحت کا جہاں
جا کے بھولے سے نہ پھرتا تھا وہاں

پند سے ناصح کی نفرت تھی اُسے
سائے سے اچھوں کے وحشت تھی اُسے

گھر میں آ اک اک سے لڑ جاتا تھا وہ
باتوں باتوں میں بگڑ جاتا تھا وہ

نفس پر اپنے نہ کر سکتا تھا جبر — نام کو اُس میں تحمل تھا نہ صبر
دل پہ قابو زینہار اُس کو نہ تھا — اور زباں پر اختیار اس کو نہ تھا
جو وہ کرتا تھا اُسے بھرتے تھے سب — اُس سے چھوٹے اور بڑے ڈرتے تھے سب
اصل میں کچھ بد نہ تھی اُس کی سرشت — کر دیے تھے جہل نے اطوار زشت
گو نہ مطلق آدمیت اُس میں تھی — پر جھلکتی قابلیت اُس میں تھی
بدچلن تھا پر نہ تھی طینت بُری — فطرت اچھی تھی مگر عادت بُری
چڑھ رہا تھا اُس پہ بدصحبت کا رنگ — لگ رہا تھا روشن آئینے کو زنگ
ذات میں اُس کی شرارت تھی نہ شر — ہو گیا تھا بد، بدوں میں بیٹھ کر

جب گئی عادت بگڑ حد سے سوا
آگیا دم ناک میں ماں باپ کا

باپ نے اِک روز گھر میں بیٹھ کر — یوں کہا بیٹے سے اے جانِ پدر
یاد ہیں وہ دن بھی تم کو یا نہیں — جب کہ یہ رعنائیاں تم میں نہ تھیں
جب خبر اپنی نہ تھی کچھ آپ کو — جانتے تھے تم نہ ماں اور باپ کو
پاسباں تھے آپ کے ماں باپ جب — گوشت کا اِک لوتھڑا تھے آپ جب
ہاتھ اور بازو یہ سب بیکار تھے — سخت بے بس تھے تم اور لاچار تھے
آنکھ سے چیپڑ چھڑا سکتے نہ تھے — مُنہ سے مکھی تک اُڑا سکتے نہ تھے
آگ پانی میں نہ تھی تم کو تمیز — تھا تمھیں زہر اور امرت ایک چیز
دل کا کہہ سکتے نہ تھے تم مدعا — جانتے تھے کچھ نہ رونے کے سوا
بھوکے یا پیاسے اگر ہوتے تھے تم — کچھ نہ کہتے تھے مگر روتے تھے تم

ہم سمجھ لیتے تھے لیکن مدعا
بھوک کا رونا ہی یا ہی پیاس کا

پیاس میں مضطر جو پاتے تھے تمہیں
بن کہے پانی پلاتے تھے تمہیں

بھوک میں گر دیکھتے تھے بے قرار
دودھ تھے تم کو پلاتے بار بار

روپ تھے معلوم سارے آپ کے
ہم سمجھتے تھے اشارے آپ کے

تم کو کچھ تکلیف ہوتی تھی اگر
خود بخود بھی دل کو ہو جاتی خبر

چین ہو جاتا تھا سارا برطرف
پھرتے تھے بے تاب دوڑے ہر طرف

ہوتے تھے بیمار دور از حال جب
رات دن رہتی تھی ماں رنج و تعب

بارہا آنکھوں میں کٹ جاتی تھی رات
اک بلا آتی تھی جب آتی تھی رات

ناز اٹھاتے تھے طبیبوں کے سدا
ڈھونڈتے پھرتے تھے شربت اور دوا

عامل اور سیانوں نے جو مانگا دیا
منہ نہ پیسے کا کبھی ہم نے کیا

چاہتے تھے تم کو خوش آٹھوں پہر
تم بسورے اور بنی یاں جان پر

ہم پہ گزریں کیسی کیسی سختیاں
گزریں دشمن پر نہ ایسی سختیاں

آئے گی خدمت ہماری یاد جب
ہوگے تم خود صاحبِ اولاد جب

سن تمہارا جب زیادہ کچھ ہوا
پھر پڑھانے کا ارادہ کچھ ہوا

اک معلم رکھا اور اک خوشنویس
یاد ہوگی تم کو اُن دونوں کی فیس

گرچہ تھی تاکید دونوں کو شدید
پر نہ دی تم نے کبھی اُن کو رسید

تم کو کب فرصت تھی کود اور پھاند سے
بھاگتے تھے تم نوشت و خواند سے

مفت کی تنخواہ وہ پاتے رہے
نام کو ہر روز یاں آتے رہے

تم نے آخر جب نہ کچھ بڑھ کر دیا
دے کے کچھ دونوں کو رخصت کر دیا

جب ہوئے فضلِ الٰہی سے جواں
سر پہ شادی کا چڑھا بارِ گراں

اپنے دل میں بس یہی ہم نے کہا
ایک بیٹا اور وہ بھی لاڈلا

کی اگرچہ یاں بھی کفایت پر نگاہ
اور ہم کو کون سے کرنے ہیں بیاہ

ٹھان کر یہ جی میں دی شادی رچا
اپنے سے جو ہو سکا سب کچھ کیا

مال اور جاں سے زیادہ کوئی چیز
آدمی کو یاں نہیں ہوتی عزیز

جان سے بھی ہم رہے خدمت گزار
مال بھی ہم نے کیا تم پر نثار

تم نے جو چاہا کھلایا وہ تمھیں
تم نے جو مانگا پنھایا وہ تمھیں

گھوڑے چڑھنے کے لیے تم کو دیے
رکھے خدمت گار خدمت کے لیے

خوب تم نے قدر کی ماں باپ کی
خوب خدمت کی ہماری داد دی

باپ کا تم کو ادب اصلا نہیں
ماں کی خدمت کی تمھیں پروا نہیں

گھر میں دو دو دن نہیں آتے ہو تم
آتے ہو اک اک سے لڑ جاتے ہو تم

لوگ شاکی ہیں تمھارے جا بجا
خود برا کہہ کے سنتے ہو برا

ہم پہ سب ہنستے ہیں اشراف و رذیل
کر دیا تم نے تو ہم کو بھی ذلیل

منہ نہیں ہوتا کسی کے رو برو
خاک میں تم نے ملا دی آبرو

ہاتھ میں زر ہے نہ بازو میں ہے زور
مار کر فکروں نے کر ڈالا ہے بھور

کام کی باقی نہیں اپنے میں تاب
مدتوں سے دے چکی ہمت جواب

آپ میں ہوتا اگر کچھ حوصلہ — آدمیت کا تھا اب یہ مقتضا
ہم رہے جیسے فِدا تم پر مُدام — تم بڑھاپے میں ہمارے آتے کام

ہم بھی یاں سُکھ پاتے کچھ اولاد کا
نام چلتا دیکھتے اجداد کا

خیر اب ہم کو تو یاں رہنا ہے کم — کوئی دِن کے اور ہیں مہمان ہم
پر تمھیں ہے کاٹنی اک عُمر یاں — ہو ابھی فضلِ الٰہی سے جواں
بس، گئیں حد سے گزر رسوائیاں — کب تلک آخر یہ بے پروائیاں
ناز و نعمت کا زمانہ ہو چکا — خواب و غفلت کا زمانہ ہو چکا
ہاتھ سے جا کر نہیں آتا ہے وقت — دیکھو بھائی ہاتھ سے جاتا ہے وقت
گر رہے اب بھی یونہیں تم نادرست — خود زمانہ تم کو کر دے گا دُرشت
گردشیں دیں گی نِکال ایک ایک بل — ٹھوکریں کھا کھا کے جاؤ گے سنبھل
پر سنبھلنا واں یہ کس کام آئے گا — جب سنبھلنے سے نہ سنبھلا جائے گا
ہو گی اُڑنے کی ہوس تم کو مگر — ہوں گے اُڑنے کے نہ اُس دم بال و پر
عقل ہو گی پر نہ ہو گا اقتدار — عزم ہو گا پر نہ ہو گا اختیار

جب کہ گیتی رنگ یہ دِکھلائے گی
تب ملامت باپ کی یاد آئے گی

سوالات

۱- تادیب ، انفار ، رعنائی ، شر ، بسورنا ، روپ ، اصلا ، مقتضا، فطرت ،

بھور اور اقتدار کے معنے بتاؤ۔

۲۔ اغیار، اشراف، انفار، اجداد، اطوار کے واحد کیا ہیں؟

۳۔ مطلب بیان کرو۔

عاقل اور سیانوں نے جو مانگا دیا — مُنہ نہ پیسے کا کبھی ہم نے کیا

اصل میں کچھ بد نہ تھی اُس کی سرشت — کر دیے تھے جہل نے اطوارِ زشت

ہوتے تھے بیمار دُور از حال جب — رات دن سہتی تھی ماں رنج و تعب

۴۔ اس سبق میں باپ نے بیٹے کو کیا نصیحت کی ہے، بیان کرو۔

۵۔ پروردہ، ناصح، شاکی، مقصود، شاطر قواعد کی رُو سے کیا ہیں؟

۶۔ لکھنا، پڑھنا، کہنا سے اسم فاعل اسم مفعول اور اسم حالیہ بتاؤ۔

۷۔ داد دینا، مضطر، دم بھرنا اور سائے سے وحشت ہونا کو جملوں میں استعمال کرو۔

سر سید احمد خاں کا خط

طالب علموں کے نام

میرے عزیزو! تم نے اس منزلِ ہستی میں قدم رکھا ہے اور میں بہت سے مرحلے طے کر چکا ہوں۔ زندگی کی پُرفضا اور پُر بہار پہاڑی پر چڑھ کر اس کے عجائبات اور غرائبات کو ایک نظر سے دیکھ کر مایوس قدموں اور حسرت بھرے دل سے نشیب کی طرف اُتر رہا ہوں۔ اور زیادہ افسوس میرا اس سبب سے ہے کہ عُمر کی پہاڑی کی سیر کرتے وقت جو اوزار مجھے قُدرت نے عِنایت کیے تھے اُن کو میں اپنی نادانی اور گمراہی سے مناسب طور پر استعمال میں نہ لاسکا۔ اب کہ عُمر کے آخری مقام پر کھڑا ہو کر پِچھلی طے کی ہوئی منزل پر نظر ڈالتا ہوں تو سوائے حسرت اور افسوس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ عمر کا جو نہایت پُر فضا اور پُر جوش حِصّہ تھا وہ گزر گیا۔ آگے کی طرف جو نظر ڈالتا ہوں تو سارے منظر وادیٔ پُر خار معلوم ہوتے ہیں اور ایسی اونچی چڑھائی نظر آتی ہے کہ جس کو کامیابی کے

ساتھ طے کرنا ایک موہوم سی اُمید ہے۔ سامنے کے منظر کی
ڈراؤنی صورت اور طے کردہ منزل کی خوبصورتی اور
بے نیلِ مرام چھوڑکر آنے کے خیالات میرے دماغ کو
ایسا پراگندہ کرتے ہیں کہ رہی سہی طاقت بھی سلب
ہوتی معلوم ہوتی ہے۔

اے عزیزو! یہ مایوسی مجھے کیوں حاصل ہوئی اور کیوں
میں حسبِ مُراد دُنیا سے بہرہ ور نہ ہُوا؟ صرف اس سبب
سے کہ میں نے وقت کی قدر نہ جانی۔ ابتدائے عُمر میں
جب کہ میں کچھ کرسکتا تھا اور اپنی بہبودی کی بُنیاد
قایم کرسکتا تھا، میں نے کچُھ نہیں کیا۔ بدقسمتی سے کوئی
رہبر یا ہادی ایسا نہ مِلا جو مجھے سیدھے راستے پر ڈالتا۔
کوئی مُربّی یا مُحسِن ایسا نصیب نہ ہُوا جو میرے افعال
و اعمال کو مُناسِب سمت کی طرف رجوع کرنے کی
کوشش کرتا۔ اپنی ہی مرضی اور اپنی عقل سے کسی
کامِل رہبر یا کمپاس بغیر اپنی کشتی کو کھیتا رہا۔ یہاں
تک کہ ایک خطرناک چٹان پر آکر بحرِ ہستی کی بے اِنتہا
سطح پر جو نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں جِن لوگوں نے
دانشمندی اور قاعدے کی پابندی سے کام لیا اور وقت
کو بے بہا سرمایہ سمجھا وہ کیسے خوش و خُرم اور بامُراد

بحرِ ہستی سے عُبوُر کر رہے ہیں۔ یوُں تو کون سی چیز تھی جو وقت کی پرواز سے مُستفید ہونے کی ضرورت نہ جتاتی مگر میں ہی نادانی سے اس کا اشارہ نہ سمجھا۔ سالہا سال سوُرج صبح سے نکل کر اس نیلگوں چھت پر اپنا معموُلی دوُرہ کرتا ہوُا مغرب میں جا ڈوبا۔ مگر میں یوُں ہی کاہلی سے بیٹھا ہوُا اُس کے مُنہ کو تکتا رہا۔ اس کے قاعدے کی پابندی سے زرا بھی سبق نہ لیا۔ چاند ہلال اور بدر ہوکر اپنے مقرر وقتوں پر ظاہر ہوتا رہا، مگر مجھے اس کے نموُنے سے نصیحت حاصل نہ ہوئی۔ بہار اپنے معموُلی وقتوں پر آئی اور عالمیوں کے واسطے خوانِ نعمت بچھاکر چلی گئی مگر حیف میں یہ نہ سمجھا کہ یہ میری ہی عُمر کا ایک سال چلے جلنے کا اشارہ کرتی ہے۔ کالے کالے مست بادل اپنے وقت پر آئے اور برس کے چلے گئے۔ بجلی نے آب و تاب کے ساتھ میری مُندی ہوئی آنکھوں کو کھولنا چاہا، مگر صد افسوس میرے خفتہ دل نے بیداری حاصل نہ کی۔ رعد نے نہایت زور شور سے کڑک کر میرے کانوں کو کھولنا چاہا مگر میرے کان پر جوُں تک نہ چلی۔ ہوا تیز اور تند، ٹھنڈی اور گرم سب قسم

کی چلتی رہی مگر مجھے زرا بھی ہوشیاری نہ ہوئی۔ گھڑی ہر وقت میری جیب میں رہی، مجھے اپنی غمناک آواز سے ہر منٹ اور سیکنڈ وقت کی پرواز سے خبر دیتی رہی، مگر میں نہ سمجھا کہ یہ دراصل میری عمرِ رواں کے پانو کی آہٹ ہی۔ ہزاروں دفعہ جیب سے نکال کر دیکھا، کبھی چھ بجے، کبھی دس بجے، کبھی بارہ بجے، مگر حیف! میں نہ سمجھا کہ یہ اپنی ہی عمرِ رفتہ کے نقشِ پا ہیں۔

بہت دفعہ ریلوے اسٹیشن گیا، ٹرین کو جانے کے لیے تیار دیکھا۔ مسافر گٹھڑی باندھے سوار ہونے کے لیے تیاری کر رہے ہیں اور بہت سے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے خوشیاں منا رہے ہیں۔ اتنے میں انجن نے سیٹی دی اور گھنٹی ٹن ٹن بجی۔ ریل یہ جا وہ جا۔ اب دیکھا تو نہ وہ ٹرین ہی نہ وہ رونق۔ اسٹیشن پر ایک پژمردگی اور اداسی کا عالم۔ اس انقلاب سے میرے دل میں ایک خفیہ چوٹ لگی۔ مگر حیف میں یہ نہ سمجھا کہ یہ ٹرین زندگی کی رفتار سے خبر دیتی ہی۔ جو لوگ کہ سوار ہوتے ہیں وہ مسافرِ ملکِ عدم ہیں اور جو آتے ہیں وہ واردانِ ملکِ

ہستی ہیں۔ اب جب کہ سمجھ آئی اور تجربہ ہوا تو وہ زمانہ رہا نہ وہ طاقت رہی۔ اب جب کہ کسی اِسکول یا کالج کی عمارت کے پاس سے گزرتا ہوں اور طالب علموں کے پڑھنے کی آواز میرے کان میں پڑتی ہے تو کھڑا ہوجاتا ہوں اور آہ سرد بھر کر کہتا ہوں کہ "افسوس اب میں دوبارہ لڑکا نہیں ہوسکتا"۔ کیا اچھا ہو کہ میں اس تجربہ کے ساتھ پھر زندگی کا ازسرِ نو سفر شروع کروں۔

اب کیا ہوسکتا ہے۔ پس اے طالبِ علمو! اور اے میرے مُلک کے ہوشیار اُمیدوارو! میں حسرت کے ساتھ تم سے مخاطب ہوتا ہوں کہ میری تلف شدہ عُمر تمھارے رستے میں نوٹس بورڈ ہو جس پر یہ درج ہو کہ:

"خبردار اِس طرف خطرہ ہے، سنبھل کر چلو!"

سوالات

۱۔ اِن لفظوں کے معنے بتاؤ:۔

وادیٔ پُرخار، بے نیلِ مرام، سلب، بہرہ ور، موہوم،

ہلال ، بذر ، کان پر جوں چلنا، کمپاس ، بہبودی ، مربّی

۲۔ مطلب بیان کرو :۔

(۱) زندگی کی پُر فضا اور پُر بہار پہاڑی پر چڑھ کر اُس کے عجایبات اور غرایبات کو ایک نظر سے دیکھ کر مایوس قدموں اور حسرت بھرے دل سے نشیب کی طرف اُتر رہا ہوں۔

(۲) جو لوگ کہ سوار ہوتے ہیں وہ مُسافرِ ملکِ عدم ہیں اور جو آتے ہیں وہ واردانِ ملکِ ہستی ہیں

۳۔ ابتدائے عمر میں وقت کی قدر نہ کرنے سے آخر عمر میں کیا صورت پیش آتی ہے؟

۴۔ مختلف قدرتی اشیا ہمیں کیا سبق دیتی ہیں؟ مثالیں دے کر واضح کرو۔

۵۔ اس عبارت میں متعلق فعل پہچانو اور اُن کی قسم بتاؤ

جب میں کچھ کرسکتا تھا ، میں نے کچھ نہیں کیا بدقسمتی سے کوئی رہبر یا ہادی ایسا نہ ملا جو مجھے سیدھے راستے پر ڈالتا۔ اور مُناسب سمت کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کرتا۔ اپنی عقل سے کسی کامل رہبر یا کمپاس بغیر اپنی کشتی کو کھیتا رہا یہاں تک کہ ایک خطرناک چٹان پر آگیا۔ یوں تو کونسی چیز تھی جو وقت کی پرواز سے مستفید ہونے کی ضرورت نہ جتاتی مگر میں ہی نادانی سے اس کا اشارہ نہ سمجھا۔ سالہاسال سورج صُبح

سے اپنا معمولی دَورہ کرتا ہُوا مغرب میں جاڈوبا مگر میں یوُں ہی کاہلی سے بیٹھا اُس کے مُنہ کو تکتا رہا۔ اب جب کہ کسی کالج کی عمارت کے پاس سے گزرتا ہوں اور طالب علموں کے پڑھنے کی آواز میرے کان میں پڑتی ہی تو کھڑا ہوجاتا ہوں اور آہ سرد بھر کر کہتا ہوں۔ "افسوس اب میں دوبارہ لڑکا نہیں ہوسکتا"

راجا بیربر

راجا بیربر کو بیربل بھی کہتے ہیں، لیکن اِن کا اصلی نام مہیش داس تھا۔ ذات کی نسبت کوئی برہمن، کوئی بھاٹ لکھتا ہو۔ کالپی کے رہنے والے تھے۔ ابتدائے جلوس اکبری میں ان کی خوش قسمتی نے ان کو کسی موقع پر بادشاہ کے سامنے پُہنچا دیا۔ خدا کی قُدرت اور قسمت کی بات تھی کہ بادشاہ کو ان کی ادا بھاگئی۔ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے اور یہ باتوں ہی باتوں میں کچُھ سے کچھ ہوگئے۔ اوّل کب رائے (مَلِکُ الشّعراء) اور پھر راجا بیربر کے خِطاب سے مؤصوُف ہوئے۔ رفتہ رفتہ اپنے لطیفوں کی بدولت بادشاہ کے مزاج میں ایسا رسُوخ پیدا کیا کہ تمام اکبری نورتن میں کوئی عالی جاہ امیر اور جلیل القدر سردار اُن کے رُتبے کو نہ پہنچ سکا۔

بیربر کے سینکڑوں لطیفے مشہور ہیں جن سے اب بھی لوگ لُطف اُٹھاتے ہیں۔ ایک دن کا ذکر ہو کہ اکبر بادشاہ نے دربار عام میں فرمایا، پتّوں میں سب سے بڑا پتّا کون سا ہو؟ حاضرین مختلِف پتّوں کے نام

لینے لگے۔ کسی نے کہا کیلے کا پتّا سب سے بڑا ہوتا ہے کسی نے کہا اڑوی کا۔ مگر بادشاہ کی تشفّی نہیں ہوئی۔ آخر سب نے عرض کیا کہ بیربر سے پوچھا جائے۔ بیربر نے عرض کیا: جہاں پناہ! سب سے بڑا پتّا پان کا ہے: جو حضور کے دہنِ مبارک تک پہنچتا ہے۔ بادشاہ اور حاضرین سب اس جواب سے خوش ہو گئے۔

راجا بیربر بادشاہ کی مصاحبت میں ہر وقت حاضر رہتے اور اپنی دانائی اور مزاج شناسی کی حکمت سے ہر معاملے میں اپنی خواہش کے مطابق حکم حاصل کر لیتے تھے۔ اسی واسطے راجا مہاراجا، اُمرا لاکھوں رُپے کے تحفے تحایف اِن کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔ بادشاہ بھی اکثر راجاؤں کے پاس ان کو سفیر بنا کر بھیجتے تھے۔ یہ جس کے پاس سفیر بن کر جاتے اپنے چٹکلوں اور لطیفوں سے اُسے رام کر لیتے تھے اور باتوں باتوں میں وہ کام نکال لاتے تھے کہ بڑی بڑی فوجوں سے نکلنا مشکل تھا۔

۹۹۱ھ ہجری میں زین خاں کوکہ کے ساتھ راجا رام چندر کے دربار میں سفیر ہو کر گئے اور کام اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ راجا رام چندر مع اپنے بیٹے بیر بھدر کے، دربار شاہی میں حاضر ہو گیا۔ اِسی سال


SAMI·40

ایک دِن جب کہ اکبر کے ساتھ نگرچین کے میدان میں چوگان بازی میں مشغول تھے، گھوڑے سے گِر کر بے ہوش ہو گئے۔ اکبر نے بڑی محبت سے سر سہلایا اور اُٹھوا کر گھر بھجوا دیا۔

سنہ ۹۹۳ ہجری میں اکبر نے زین خاں کوکلتاش کو باجوڑ وغیرہ علاقے کے سرحدی پٹھانوں کی تادیب کے واسطے فوجیں دے کر روانہ کیا۔ یہ لوگ ہمیشہ لوٹ مار سے اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ جب بادشاہی فوجیں مُقابلے کو جاتیں، اوّل مقابلے پر آمادہ ہوتے اور جب دبتے تو پہاڑوں میں گھس جاتے تھے۔ اِدھر فوج واپس ہوئی اُدھر اُنھوں نے پیچھا مار کر فتح کو شِکست سے بدل دیا۔ زین خاں کوکلتاش نے پہلے باجوڑ پر ہاتھ ڈالا اور آگے بڑھ کر بادشاہ کو مدد کے واسطے لکھا۔ جب دربار میں یہ معاملہ پیش ہُوا کہ کون امیر اِمداد کے واسطے روانہ کیا جائے تو سب سے پہلے اُبوالفضل نے اپنے واسطے درخواست کی۔ یہ دیکھ کر بیربر جی سے نہ رہا گیا، فورًا بول اُٹھے کہ غُلام کو اِجازت ہو۔ اگرچہ بادشاہ کو ان کی ایک دم کی جُدائی بھی سخت ناگوار تھی مگر نہ معلوم کیا خیال آگیا کہ اِجازت دے دی

ور نہایت شفقت سے فرمایا کہ خاصے کا توپ خانہ بھی ساتھ لیے جاؤ۔ رخصت کے وقت دریائے محبت جوش میں آیا اور اِن کے بازو پر ہاتھ رکھ کر ارشاد فرمایا کہ بیربر جلدی آنا۔

راجا بیربر کے روانہ ہونے کے بعد بادشاہ نے حکیم ابوالفتح کو بھی فوج دے کر روانہ کیا۔ راجا بیربر اور حکیم ابوالفتح زین خاں سے جا ملے۔ اگرچہ راجا اور زین خاں میں پہلے سے چشمک چلی آتی تھی لیکن جب زین خاں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی، حوصلۂ سپہ سالاری کو کام میں لایا۔ ان کا اِستقبال کیا اور صفائی اور گرمجوشی سے باتیں کیں۔ چکدرہ کے مقام پر زین خاں نے جشن منایا اور سب کو اپنا مہمان قرار دے کر بہت کچھ مہمان داری کے سامان مہیا کیے اور سب کو بلایا اور یہ بھی مصلحت سوچی کہ اِسی مقام پر سب کی رائے سے اِتفاق کر کے آیندہ جنگ کی تجویزوں پر عمل در آمد کیا جائے۔ لیکن چوں کہ اکبر کی نازبرداری نے راجا کا مِزاج عرش پر پہنچا رکھا تھا وہ بھپر گئے اور بہت سے شکوے شکایتیں کر کے کہنے لگے کہ بادشاہی توپ خانہ ہمارے ساتھ ہے، بندگانِ شاہی کو لازم تھا کہ اُس کے گرد آ کر جمع ہوتے اور ہمارے ہاں

صلاح و مشورے کی گفتگو ہوتی۔ اگرچہ راجا کی یہ تقریر
زین خاں کو ناگوار گزری لیکن اس پر بھی وہ بے تکلّف
اُن کے پاس چلا آیا حکیم ابوالفتح اور راجاجی میں بھی
صفائی نہ تھی چنانچہ تینوں سرداروں میں اِختلاف ہوگیا
اور روز بروز عداوت اور نِفاق بڑھتا گیا۔ اس کا یہ نتیجہ ہُوا
کہ لاڈلے راجا نے اپنے گھمنڈ میں زین خاں کی رائے
کے خلاف ایک طرف کوچ کر دیا۔ مجبور ہو کر زین خاں
بھی پیچھے پیچھے ہولیا۔ پہاڑی مُلک اُس پر طرّہ یہ کہ راجا
محلوں کے شیر تھے، مرد شمشیر نہ تھے اور اُنھیں اس قسم
کے معرکوں سے اپنی زندگی بھر کبھی اتفاق نہ پڑا تھا۔ ایک
دن جب کہ ایک ایسی پہاڑی سے لشکر گزر رہا تھا کہ جس
کے تنگ راستے کے نیچے بڑی بڑی گھاٹیاں اور کھڈ واقع
تھے، افغان آپڑے۔ بادشاہی لشکر میں کہرام مچ گیا۔ راستہ
ایسا تنگ تھا کہ دو سوار بھی برابر نہ چل سکتے۔ اندھیرا ہونے
پر افغانوں نے اور بھی موقع پایا۔ آگے پیچھے اوپر نیچے سے
گولیاں اور پتھر برسانے شروع کیے۔ ہاتھی گھوڑے آدمی
اونٹ گائے بیل ایک پہ ایک گرتا تھا، ایک کو دوسرے
کی خبر نہ تھی۔ زین خاں نے غیرت کے مارے چاہا کہ ایک
جگہ اڈکر جان قربان کر دے۔ ایک سردار دوڑا ہُوا آیا

اور زبردستی اُس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر اُس انبوہ سے نِکال لے گیا۔ گھاٹیوں میں اتنے آدمی، گھوڑے، ہاتھی پڑے تھے کہ راستہ بند ہوگیا تھا۔ ناچار گھوڑے کو چھوڑ کر پیادہ ہُوا اور بے راہ ایک پہاڑی پر چڑھ کر بھاگا اور امیر بھی گھبراہٹ میں کہیں کے کہیں جا پڑے۔ بہُت کم بچ کر صحیح سلامت آئے۔ بہُت سے قید ہوئے اور مارے گئے۔ حکیم ابوالفتح بھی کِسی حِکمت سے بچ آئے۔ مگر بیربر جی کا پتا نہ مِلا۔ یہ شِکشت ایسی ہوئی کہ تمام اکبری عہد میں اِس کی نظیر نہیں مِلتی۔ چالیس ہزار فوج میں سے جس میں بڑے بڑے امیر اور درباری منصب دار شامِل تھے بہُت کم لوگ باقی بچے۔ زین خاں اور حکیم ابُوالفتح نے کمال بدحالی کے ساتھ اٹک میں آکر دم لیا۔ افغانوں کو اِتنی لوٹ ہاتھ آئی کہ سات پُشت تک نصیب نہ ہوئی ہوگی۔

جب اِس شِکشت اور راجا بیربر کے مارے جانے کا حال اکبر کو معلوم ہُوا تو اس کو اِتنا رنج ہُوا کہ عمر بھر کبھی نہ ہُوا تھا۔ دو رات دِن کھانا نہیں کھایا۔ جب مریم مکانی (والدۂ اکبر) نے سمجھایا اور بندگانِ عقیدت کیش نے نالہ و زاری کی تو مجبور

ہو کر کچھ کھایا۔ زین خاں اور حکیم ابو الفتح مدتوں سلام سے محروم رہے لاش کی بڑی تلاش رہی مگر دستیاب نہ ہوئی۔ اِس موقع پر جو طولانی فرمان مرزا عبد الرحیم خانِ خاناں کے نام بادشاہ نے لکھوایا تھا وہ ابو الفضل کے پہلے دفتر میں موجود ہی۔ اُس سے بادشاہ کے رنج و الم کا حال بخوبی ظاہر ہوتا ہی۔

راجا بیربر کے فراق میں جب لوگوں نے بادشاہ کی بیتابی اور بے قراری کا حال دیکھا تو رنگا رنگ کی خبریں لانے لگے۔ کوئی جاتری آکر کہتا کہ میں جوالا جی سے آیا ہوں، جوگیوں کے غول میں بیربر چلا آتا تھا۔ کوئی آکر یہ کہتا کہ سنیاسیوں کے غول میں بیٹھا کتھا بانچتا تھا۔ بادشاہ کے دل کی بے قراری ہر بات کی تصدیق کرتی تھی۔ خود کہتے تھے کہ وہ غیرت والا تھا، تعجب کیا ہی کہ شکست کی شرمندگی سے فقیر ہو کر نکل گیا ہو۔

مدتوں تک اِسی قسم کی نئی نئی خبریں اُڑتی رہیں اور بادشاہ کا رنج و الم تازہ ہوتا رہا۔ بہت سے لوگوں نے جھوٹی خبریں اُڑانے کی پاداش میں سزا پائی۔ غرض کہ راجا بیربر کی موت بھی ایک لطیفہ بن گئی۔

راجا بیربر کا منصب کاغذی حساب سے دو ہزاری تھا

لیکن عنایت اِس قدر تھی کہ ہزاروں لاکھوں رُپے کے جواہر برس بلکہ مہینوں میں عطا ہوجاتے تھے۔ اکبر اُنھیں ایسا محرمِ راز سمجھتے تھے کہ اُن سے کسی طرح کا پردہ نہ تھا۔ یہاں تک نوبت پہُنچی تھی کہ آرام کے وقت حرم سرا کے اندر بھی بُلا لیے جاتے تھے۔

سوالات

ان لفظوں کے معنے بتاؤ:-

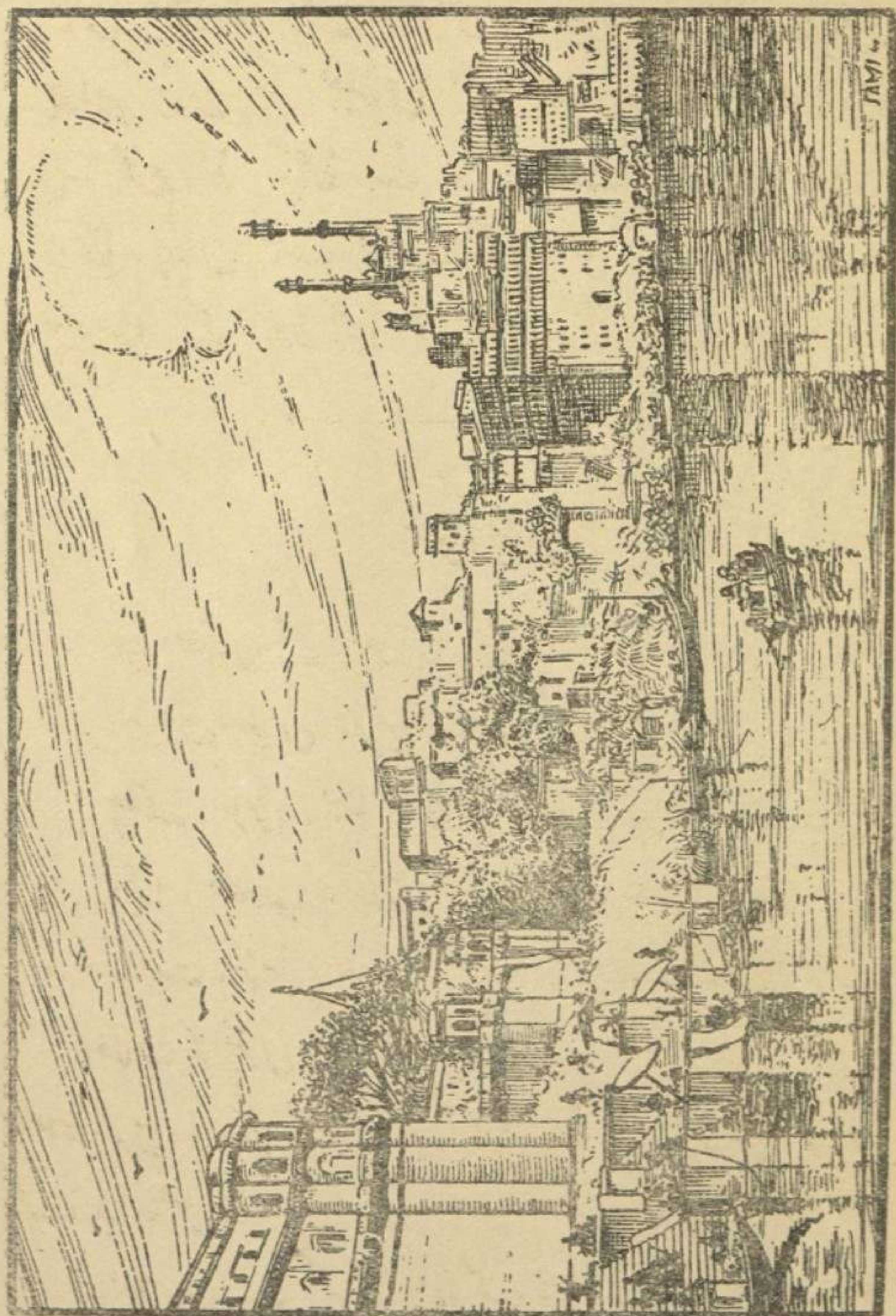
ابتدائے جلوس اکبری، لطیفہ، پیش کش، چوگان بازی، رسوخ، چشمک، عرش، جلیل القدر، معرکہ، کُہرام، عقیدت کیش، الم، بانکپنا، منصب، جاتری، پاداش، خاصہ، محرم۔

۲۔ مصاحبت، خوش اسلوبی، رام کرنا، ارشاد، بپھرنا، گرمجوشی اور اختلاف کو جملوں میں استعمال کرو۔

۳۔ اکبری نو رتن سے کیا مراد ہے؟ راجا بیربر کو ان نو رتنوں میں کیا درجہ حاصل تھا؟

۴۔ راجا بیربر سے اکبر کا برتاؤ کیسا تھا مثالیں دے کر واضح کرو۔

۵۔ راجا بیربر باجوڑ کیوں گئے اور وہاں اُن کے ساتھ کون سے واقعات پیش آئے، مختصراً بیان کرو۔



بارش کا پہلا قطرہ

گھنگور گھٹا تُلی کھڑی تھی ۔ پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی
ہر قطرے کے دل میں تھا یہ خطرہ ۔ ناچیز ہوں میں غریب قطرہ
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس ۔ اپنا ہی کروں گا ستیاناس
آتی ہے برسنے سے مجھے شرم ۔ مٹی پتھر تمام ہیں گرم
خالی ہاتھوں سے کیا سخاوت ۔ پھیکی باتوں میں کیا حلاوت
کس برتے پہ میں کروں دلیری ۔ میں کون ہوں کیا بساط میری
ہر قطرے کے دل میں تھا یہی غم ۔ سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم
کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی ۔ کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی
ایک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور ۔ ہمت کے محیط کا شناور
بولا للکار کے کہ آؤ ۔ میرے پیچھے قدم بڑھاؤ
کر گزرو جو ہو سکے کچھ احسان ۔ ڈالو مردہ زمین میں جان
یارو یہ اگر مگر کہاں تک ۔ اپنی سی کرو بنے جہاں تک
مل کر جو کرو گے جانفشانی ۔ میدان میں پھیر دو گے پانی

کہتا ہوں یہ سب سے برملا میں
آتے ہو تو آؤ لو چلا میں

یہ کہ کے وہ ہو گیا روانہ ۔ دشوار ہے جی پہ کھیل جانا

ہر چند کہ تھا وہ بے بضاعت
کی اس نے مگر بڑی شجاعت

دیکھی جُرأت جو اس سخی کی
دو چار نے اور پیروی کی

پھر ایک کے بعد ایک ٹپکا
قطرہ قطرہ زمیں پہ ٹپکا

آخر قطروں کا بندھ گیا تار
بارش لگی ہونے مؤسلا دھار

پانی پانی ہُؤا بیاباں
سیراب ہوئے چمن خیاباں

تھی قحط سے پایمال خلقت
اس مینہ سے ہوئی بِہال خلقت

جُرأت قطرے کی کر گئی کام
باقی ہی جہاں میں آج تک نام

اے صاحبو! قوم کی خبر لو
قطروں ہی سا اِتفاق کر لو

قطروں ہی سے ہو گی نہر جاری
چل نِکلیں گی کشتیاں تمھاری

سوالات

۱۔ برملا، جاں فشانی، خلقت، بضاعت، خیاباں، بیاباں اور پایمال کے معنے بتاؤ۔

۲۔ سرگوشی، بِہال، کھچڑی پکنا، جی پر کھیل جانا، تار بندھ جانا، پیروی کرنا کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔

۳۔ اشعار ذیل کا مطلب بیان کرو:-

(ا) خالی ہاتھوں سے کیا سخاوت
پھیکی باتوں میں کیا حلاوت

اِنسانیت اور درندگی



لومڑی :۔ "آہا خالہ بلّی تم تو انسانوں میں ایسی گھُل مِل گئیں
کہ ہم غریب جانوروں کی طرف بھُول کے بھی رُخ
نہیں کرتیں"۔

بِلّی :۔ "بُوا! یہ تُم کیا کہتی ہو۔ اِن انسانوں سے تو ہم
غریب جانور ہی کچھ اچھے ہیں۔ مجھے تو اِن کی صُحبت
سے نفرت سی ہوتی جاتی ہے"۔

لومڑی :۔ "کیوں خیر تو ہے! آج تو تم عجب اُکھڑی اُکھڑی
باتیں کر رہی ہو۔ کیا کسی سے لڑ کے آئی ہو؟"

بِلّی :۔ (مُسکرا کے) "بھلا اس بڑھاپے میں کسی سے لڑوں گی۔

تم جانتی ہو کہ میری تین پُشتیں اِنھیں اِنسانوں کے
ساتھ رہتے سہتے گزری ہیں لیکن جوں جوں مجھے
اِن کے حالات سے زیادہ واقفیت ہوتی جاتی ہی،
میری بدگمانی اور بڑھتی جاتی ہی۔ بعض اوقات جب
میں تنہائی میں بیٹھ کے سوچتی ہوں تو مجھے حیرت
ہوتی ہی کہ انسانوں کو ہم پر کیوں ترجیح دی جاتی
ہی۔ خیر، انسان اپنے آپ کو ہم سے افضل سمجھیں
تو سمجھیں مگر یہ بدنصیب جانور بھی تو ایسا ہی سمجھتے
ہیں۔ مگر جہاں تک میں نے اس پر غور کیا ہی
حقیقت اس کے خلاف ہی"۔

لومڑی:۔"تم اس بُڑھاپے میں روز بروز فلسفی ہوتی جاتی
ہو اور کیوں نہ ہو! آخر تم اُس خاندان سے ہو
جس کی کسی زمانے میں پوُجا ہوتی تھی اور سونے
پر سُہاگا یہ کہ صحبت مِلی تو حضرتِ اشرفِ
مخلوقات کی"۔

بلّی:۔ (قہقہہ لگا کے) ہاہا! "اشرفِ مخلوقات! انسان اور
اشرفِ مخلوقات! ارذلِ مخلوقات کہو ارذلِ مخلوقات"۔

لومڑی:۔ آج تو بے ڈھب تمھارا مزاج بگڑا ہُوا ہی۔ میں
تو بے شک اب تک یہی سمجھتی ہوں کہ اِنسان

اشرف مخلوقات ہی اور ہم بے عقل ناکارہ، ذلیل ادنیٰ جانور ہیں "

بلّی:- بے شک۔ اس سے زیادہ بے عقلی کیا ہوگی کہ تم انسان کو اشرف مخلوقات سمجھتی ہو۔ اِنسان اپنے مُنہ میاں مٹھو بنا کرے گر تمہاری عقلوں پر کیا پتھر پڑ گئے کہ تم بھی اُسے اشرف و افضل سمجھنے لگیں۔ بڑا رونا تو یہی ہی"

لومڑی:- سمجھنے لگے کی بھی ایک کہی! کیا وہ درحقیقت اشرفِ مخلوقات نہیں ہی؟"

بلّی:- "کیسے؟"

لومڑی:- کیسے! تم اُن کی مُصاحِب ہو۔ یہ باتیں مُجھ سے کہیں بہتر جانتی ہو۔ لیکن آنکھیں میرے بھی ہیں، اِتنا میں بھی دیکھتی ہوں کہ آج وہ اس عالم کا بادشاہ اور حاکمِ مُطلقُ العِنان ہی۔ وہ روئے زمین پر اس طرح چھایا ہُوا ہی جیسے درخت پر اکاس بیل۔ اُس کے سامنے شیر کی شیری، ہاتھی کی مستی، تیندوے کی خونخواری، لومڑی کی مکاری گرد ہی۔ وہ دُور ہی سے کھڑے کھڑے ایسی تُرائیں سے آواز کرتا ہی کہ حضرتِ جنگل کے بادشاہ زمین

پر دراز ہو جاتے ہیں۔ مجھے تو کبھی اُس کے گھروں میں جانے کا اتفاق نہیں ہُوا لیکن سُنا ہے کہ وُہ بڑے بڑے عالی شان محلوں میں رہتا ہے۔ ایسے ایسے نفیس کھانے کھاتا ہے کہ ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں آتے۔ جو رستہ ہم ہفتوں، برسوں میں طے کرتے ہیں، وہ گھنٹوں میں طے کرلیتا ہے۔ وہ خوفناک جنگلوں اور طوفان خیز سمندروں کو اس طرح طے کرتا ہے جیسے کوئی چمن میں سیر کر رہا ہو۔ اُس کی صنعت و حرفت اور حکمت دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اُس کے سامنے سے جنگل کے شیر اور بیابان کے غوُل اس طرح بھاگتے ہیں جیسے چیتے کے سامنے سے ہرن یا دُھنویں سے مچھر۔ غرض اس کی حکومت مُسلّم اور اُس کی عقل و حکمت حیرت انگیز ہے۔ بھلا ہمیں اُس سے کیا نسبت؟"

بلّی:۔ "میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنی فصیح البیان ہو۔ لیکن میری پیاری لومڑی! یہ سب خول ہی خول ہے۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور۔ تم اس بھولی صورت سنگ دل خونخوار درندے یعنی انسان کو کیا جانو۔ اِس میں

وہ وہ گُن بھرے ہیں کہ خُدا پناہ ہیں رکھے"۔

لومڑی:۔ تو میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں ۔ تُم اُس کی چہیتی اور پیاری ہو، تمھیں کو معلوم ہوگا"۔

بلّی:۔ خاک پڑے اس پیار پر، میں تو اُس کی صوُرت سے بیزار ہوں"۔

لومڑی:۔ آخر کیوں؟ میں بھی تو جانوُں کہ اُس نے کیا قصوُر کیا ہے۔ یہ مُعما تو میری سمجھ میں نہیں آتا"۔

بلّی:۔ یہ تو میرا دل ہی جانتا ہے کہ وہ کیسا ہے۔ خیر تُم سے کیا چھپاؤں، لو اب کان دھر کے سُنو۔ یہ بھید سب کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ بی لومڑی! تم آبادی سے دوُر جنگل میں رہتی ہو۔ تم اس انسان کو کیا جانو۔ میری تو ساری عُمر اس کے ساتھ گزری ہے۔ میں نے اِس کے تمام کرتوُت اپنی آنکھوں سے دیکھے اس کی باتیں سُنیں اور اسے کتابیں پڑھتے سُنا ہے جانوروں کا تو کیا ذکر، اس نے اپنے ہزاروں بھائی انسانوں کو قتل کرڈالا۔ اُن کی کھوپڑیوں کے مینار بنادیے، اُن کی لاشوں سے دریا پاٹ دیے۔ اچھا تم ہی ایمان سے کہو کہ تم نے کبھی کسی شیر کو شیر کھاتے، کسی تیندوے کو تیندوے کا خوُن

بیٹے کسی لومڑی کو لومڑی ہضم کرتے دیکھا یا سنا ہی؟

لومڑی۔ ہرگز نہیں خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔

بلی:۔اب تم ہی انصاف کرو کہ یہ کہاں کی تہذیب و شرافت ہی۔ اچھا اسے جانے دو۔ یہ سب جانتے ہیں کہ شیر کس پھرتی سے جھپٹ کر ہرن کو دبا لیتا ہی۔ اور پھر اُس کا خون پی کر اور سیر ہوکر دھوپ میں آرام کرنے کے لیے جا بیٹھتا ہی اس وقت اُس کے سامنے ہرنوں کی ڈاریں گزر جائیں تو وہ آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یا تو کوئی جانور دوسرے جانور پر کھانے کے لیے حملہ کرتا ہی یا وُہ اپنی حفاظت کے لیے اُسے مارتا ہی۔ لیکن یہ اشرف مخلوقات انسان صرف پیٹ بھرنے یا اپنی حفاظت ہی کے لیے دوسروں کو نہیں مارتا بلکہ محض تفریح کے لیے ہزارہا بے گناہوں کا خون کرڈالتا ہی اور اس شریف فن کا نام اس نے سیر و شکار رکھا ہی۔ قربان جائیے اس تفریح کے! بات یہ ہی کہ اس کی فطرت میں خونخواری ہی۔ ایک چھوٹا سا بچہ جس کی عمر چار پانچ برس سے زیادہ نہیں ہوتی، ایک خوبصورت پھول کو توڑتا اور بلا وجہ اُس کی نازک پتیوں کو نوچ کر

ہوا میں اُڑا دیتا ہے۔ جب ذرا بڑا ہوتا ہے تو معصوم پرندوں کے انڈے توڑتا اور اُن کے غریب و بیکس بچوں کو گھونسلوں میں سے نکال نکال تڑپا تڑپا کے مار ڈالتا ہے اور خوش ہوتا ہے اور جب جوان ہوتا ہے تو جنگل کے بے گناہ جانوروں کا شکار کرتا اور اُن کو مار کر اس قدر خوش ہوتا ہے جیسے کوئی اِقلیم فتح کرلی۔ پھر طُرّہ یہ کہ جان لے کر ہی بس نہیں کرتا بلکہ اُن کی کھالیں کھچوا کھچوا کر اپنے مکان میں بچھاتا اور دیواروں پر لگاتا ہے۔ خوبصورت اور نازک پرندوں کو مار کر اُن کی کھالوں میں بھُس بھرواتا ہے اور گھروں کی محرابوں اور طاقچوں میں خوش نمائی کے لیے رکھتا ہے اور اُسے اپنے مکان کی آرایش و زینت کہتا ہے۔ یہ ہے انسانوں کی انسانیت"

لومڑی:۔ "خالہ! آج تم نے تو بڑے بڑے بھید بتائے توبہ توبہ! کسی کو مار کر خوش ہونا کیسی بڑی سنگدلی ہے اور یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اِنسان اِنسان ہی کو قتل کرتا اور اُس کے قتل پر فخر و مسرت کرتا ہے۔ ہم میں بھی ہزارہا قسم کے جانور ہیں مگر کوئی بِلا

وجہ کسی کو مار کر خوش نہیں ہوتا، چہ جائے کہ اپنے ہم جنس کو۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے۔"

بلّی:۔ اجی اور سنو! تمھیں ایک نئی بات سناتی ہوں۔ تم نے کبھی دیکھا یا سنا ہی کہ شیر کا غلام شیر ہو، تینڈوے کا نوکر تینڈوا یا ہاتھی کا نوکر ہاتھی یا بلّی کی باندی بلّی ہو یا کوئی جانور کسی جانور کا غلام ہو؟"

لومڑی:۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہی۔ یہ تو بالکل خلاف فطرت ہی۔"

بلّی:۔ "مگر تمھیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ انسان دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بناتا ہی اور انھیں بیچتا اور خریدتا ہی یا دوسرے انسانوں کو اپنا نوکر اور خدمت گار بنا رکھتا ہی اور اُن پر طرح طرح سے حکومت کرتا ہی۔"

لومڑی:۔ تم سچ کہتی ہو، یہ موا اشرفِ مخلوقات کیسا، ارذلِ مخلوقات ہی۔"

بلّی:۔ بس ایک دو ہی باتیں سن کر تمھارے ہوش و حواس جاتے رہے۔ اس کے کرتوت دیکھو تو جان سے بیزار ہو جاؤ۔ یہ میرا ہی دل گردہ ہی کہ اس کے ساتھ رہتی ہوں اور زندہ ہوں۔ اچھا ایک آدھ بات اور سنائے دیتی ہوں۔"

لومڑی:۔ انسان کی خونخواری کا حال سن کر بے شک میرے

ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہے۔ کوئی اور کہتا تو میں کبھی یقین نہ کرتی۔ اچھا اور فرمائیے۔"

بلّی:۔ لیجیے! ایک اور عجیب بات سناتی ہوں۔ ہم میں سے جب کوئی درندہ کسی وجہ سے کسی دوسرے کا دشمن ہو جاتا ہے تو وہ انتقام کے لیے اس پر حملہ کرتا ہے اور مار ڈالتا ہے۔ اس کے بعد وہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور پھر اس کا خیال بھی نہیں کرتا۔ لیکن انسان کی ہر بات انوکھی ہے وہ جوں جوں کسی دوسرے انسان کو دباتا ہے اس کا غصہ اور بڑھتا ہے اور جوں جوں وہ انتقام لیتا ہے اس کے انتقام کی پیاس اور بڑھتی ہے۔ وہ اپنا انتقام وہیں تک نہیں رکھتا جس سے اسے عداوت ہے، بلکہ اس کے عزیز و اقارب سے، یار دوستوں سے نوکر چاکروں سے اس کے ملنے جلنے والوں سے سب سے انتقام لیتا اور ان کی دل آزاری اور انھیں تکلیف پہنچانے کی فکر میں رہتا ہے۔ بلکہ بعض اقوام اُن میں ایسی ہیں کہ انتقام موروثی طور پر باپ سے بیٹے اور بیٹے سے اس کے بیٹے تک سالہا سال تک برابر پہنچتا ہے اور وہ اسی طرح ایک دوسرے کے

خون کے پیاسے رہتے ہیں اور جنگ، قتل و غارت کا بازار برابر گرم رہتا ہے۔ تم نے کبھی درندوں میں بھی ایسی موروثی عداوت اور انتقام سُنا ہے؟"

لومڑی:۔ ہرگز نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص سے لڑے اور لڑکر فیصلہ کرلے تو پھر بھی وہ عداوت خاندان اور قبیلوں میں صدہا سال تک جاری رہے اور برابر ایک دوسرے سے انتقام لیتے رہیں۔ واہ! واہ وا!! اِن اِنسانوں پر خدا کی مار، بے شک ارذلِ مخلوقات ہیں۔ بس خالہ: مجھے مُعاف رکھو، میں ایسے افسانے سُننا نہیں چاہتی۔ اِن رحم دل اِنسانوں سے تو ہم غیر ذی عقل ناپاک درندے اچھّے۔ اِن کی انسانیت ان ہی کو مبارک رہے۔

بِلّی:۔"اجی! تم نے ان کی مکّاری و عیّاری کے حالات تو سُنے ہی نہیں۔ انسانوں میں لومڑی بہت مکّار مشہور ہے۔ مگر انسان کی مکّاری کے سامنے اس بے چاری کی کیا حقیقت ہے۔"

لومڑی:۔ آہا! وہاں میرا بھی ذِکرِ خیر ہوتا ہے"

بِلّی:۔"ہاں! آپ کی عیّاری تو اُن میں ضرب المثل ہے۔"

لومڑی :۔" خدا ان کو غارت کرے۔ مکار! دغاباز! خونخوار! خدا کے لیے خالہ بلی بس کرو۔ میں اس ظالم ناپاک مخلوق کا حال سننا نہیں چاہتی۔ تعجب ہے کہ تم ان میں کیسے رہتی ہو۔ شاباش ہے تمھارے دل جگر کو"۔

بلی :۔" بوا لومڑی! اگرچہ وہ مجھ سے پیار اور محبت کرتے ہیں مگر مجھ سے بدگمان بھی بہت ہیں۔ البتہ کتے کو وہ بہت وفادار اور اطاعت گزار سمجھتے ہیں۔ اس بے غیرت نے ایک ٹکڑے روٹی کے لیے اپنی آزادی اور شرافت انسان کے ہاتھ بیچ رکھی ہے"۔

لومڑی :۔ مجھے تو اس موئے کتے سے نفرت ہے۔ خدا سب کو اس خونخوار ناپاک کے پنجے سے نجات دے۔

بلی :۔" آمین! اب بہت دیر ہوگئی ہے۔ لو بوا لومڑی، میں اب جاتی ہوں۔ اگر زندگی ہے تو پھر ملوں گی"۔

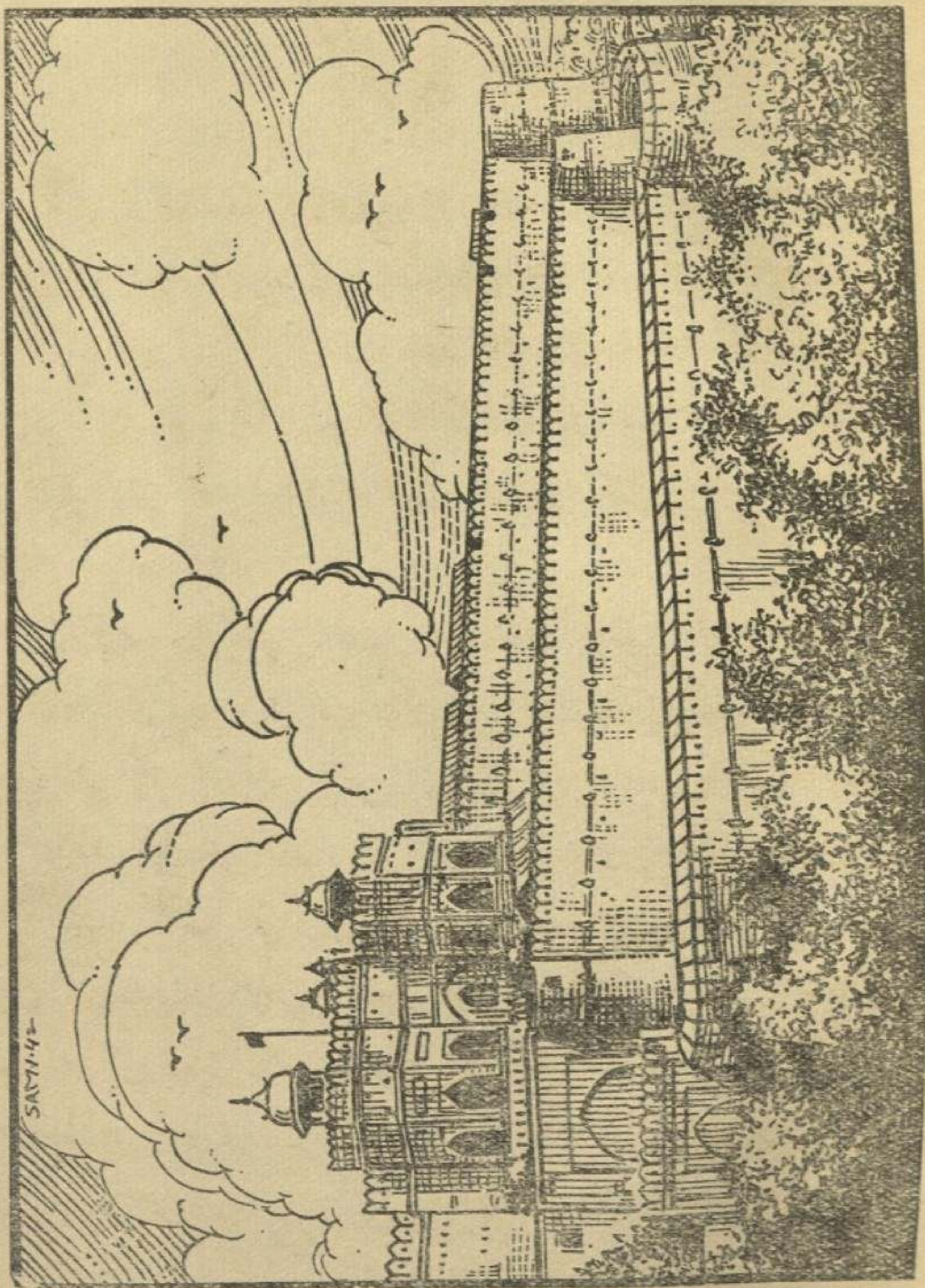
لومڑی :۔" آج تو خالہ بلی تم نے وہ وحشت ناک باتیں سنائی ہیں کہ میرے اوسان جاتے رہے۔ خدا سب پر رحم کرے"۔

بلی :۔" ابھی تم نے سنا ہی کیا ہے۔ یہ تو سمندر میں سے ایک قطرہ ہے۔ خدا حافظ"

آگرہ

آگرہ یا اکبرآباد ہندستان کا ایک قدیم شہر ہی جو ایک زبردشت راجا جمراج کی راجدھانی تھا اور اُسی مُناسبت سے اُس عہد میں جم پرست کے نام سے موسوم تھا۔ آگرے کی وجہ تسمیہ میں مؤرخین کا اختلاف ہی اور قطعی طور سے کوئی صحیح وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس کا یہ نام کیوں پڑ گیا۔

اسلامی عہد میں سب سے پہلے سُلطان محمّد ابراہیم ابن مسعود غزنوی کے عہد (۴۵۰ھ / ۱۰۵۸ء لغایت ۴۹۱ھ / ۱۰۹۸ء) میں آگرے کا ذکر آتا ہی۔ اِس زمانے میں یہاں ایک مضبوط قلعہ موجود تھا جسے اُس کے بیٹے محمود نے فتح کیا۔ سلاطین غلام، خلجی، تُغلق اور سیدوں کے عہد میں آگرہ ایک معمولی حیثیت کا گانو یا قصبہ تھا۔ ۸۹۷ھ / ۱۴۹۱ء میں جب سُلطان سِکندر لودھی نے آگرے کا قلعہ فتح کیا تو اس مقام کو راجپوتانے کا دروازہ سمجھ کر اپنے دارُ السّلطنت کے واسطے پسند فرمایا۔ قلعہ از سرِ نو تعمیر کیا گیا اور شہر کی آبادی میں ایسی کوشش کی گئی کہ تھوڑی ہی مدّت میں عالی شان



شہر آباد ہوگیا جو دریائے جمنا کے دونوں طرف آباد تھا۔ بادشاہ کی علم دوستی اور کمال پروری سے چند ہی روز میں آگرہ اسلامی علوم و فنون کا مرکز اور اہل کمال کا مرجع ہوگیا اور اُس کی شہرت تمام اسلامی دنیا میں پھیل گئی اور آگرہ علم و فضل کے لحاظ سے بغداد و شیراز کا ہم پلّہ سمجھا جانے لگا۔

۲۲۔ رجب ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) کو بابر نے ہندستان فتح کرکے آگرے میں قدم رکھا اور جمنا پار کابُل کے نام سے ایک جدید مُغلیہ نو آبادی قایم کی جہاں عالی شان عمارتیں اور پُر فضا باغات تعمیر کرائے اور سب سے پہلے آگرے میں کابُل کے خربوزوں، انگوروں اور دیگر میوہ جات کی کاشت کرائی، مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں۔

بابر، ہمایوں، سلیم شاہ سوری اور محمد عدلی کے زمانے میں آگرہ دارالسلطنت رہا۔ قلعے کے اندر ایک بارہ دری جو سلیم گڑھ کے نام سے موسوم ہے، سلیم شاہ کے عہد کی یادگار باقی ہے۔

ہمایوں نے دوبارہ آگرہ فتح کرکے دہلی کو دارالسلطنت بنایا لیکن شہنشاہِ اکبر نے پھر آگرے کو اپنا دارالخلافہ مقرر کیا۔ اُس وقت سے اس کی آبادی اور شہرت ایک سے

ہزار ہوگئی۔ اُس وقت تک قلعے کی عمارت خشتی تھی جو از سرِ نو سنگین کی گئی اور اُس کے اندر عالی شان حویلیاں سرسبز و شاداب باغات تعمیر کیے گئے۔ شہر کے اندر اور قرب وجوار میں اُمرائے شاہی کی عالی شان حویلیاں، مقابر، مساجد تعمیر ہوئیں۔ نہ صِرف ہندُستان بلکہ تمام اسلامی ممالک اور یورپ و ایشیا کے بڑے بڑے علمار و فضلا اور ہر قسم کے اہلِ کمال اس شہر میں آکر آباد ہوگئے اور یہاں کی صنعت و حرفت اور علم و دولت کا شہرہ تمام دُنیا میں ہوگیا۔ ابُوالفضل آئینِ اکبری میں لکھتے ہیں کہ آگرے کی ہوا خوبیوں اور لطافت میں بے نظیر ہی۔ کارِ زِراعت پسندیدہ اور انواع و اقسام کے خوشبودار پھول اور میوے اور عمدہ پان یہاں ملتے ہیں۔ انگور اور خربُوزہ ایران اور توران کی مانند یہاں پیدا ہوتا ہی۔ آگرہ بڑا شہر ہی۔ دریائے جمنا پانچ کوس تک شہر کے درمیان بہتا ہی جس کے دونوں جانب دِل کُشا مکانات اور روُح افزا باغات واقع ہیں۔ ہر مذہب اور ملّت کے لوگ یہاں آباد ہیں۔ ہفت اقلیم کے مال کا مجمع ہی جہاں پناہ نے اس کو سنگِ سُرخ کے قلعہ اور عماراتِ عالیہ سے آراستہ کیا ہی اور نقاشانِ نادِرہ کار اور مصورانِ نظر فریب نے اِن عمارات میں طرح طرح کے کارنامے

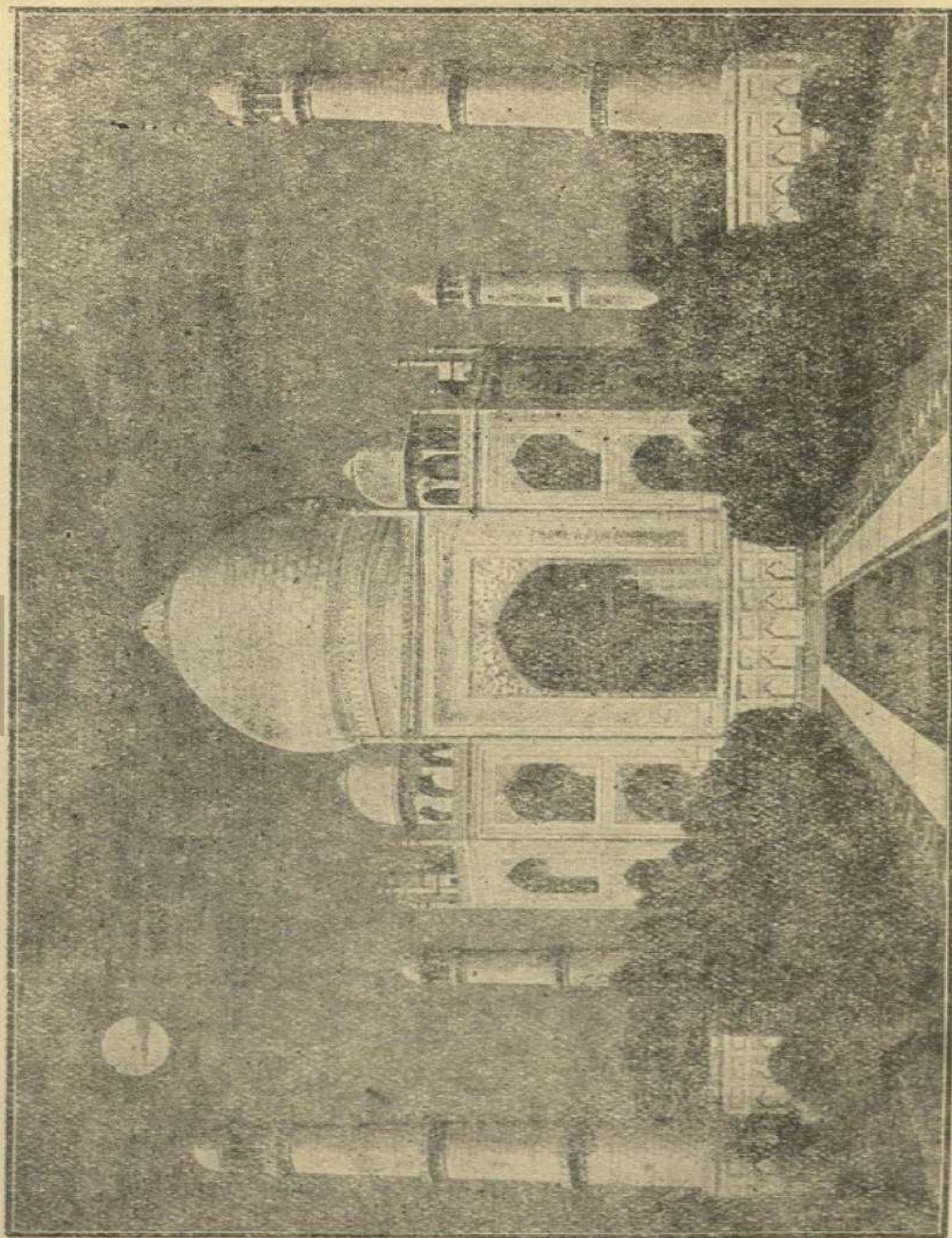
بنائے ہیں۔

جہانگیر کے عہد میں شہر کی آبادی اور عماراتِ شاہی خصوصًا باغات کی تعمیر میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ نورجہاں بیگم نے نور افشاں، نور منزل، نور پری وغیرہ نام سے کئی نفیس و بے نظیر باغات تعمیر کرائے۔ شاہجہاں کے زمانے میں آگرے کی آبادی اور رونق کمال کے درجے پر پہنچ گئی۔ اُس وقت تک آگرہ اپنے اصلی نام سے موسوم تھا شاہجہاں نے دادا کی یادگار میں اس کا نام اکبرآباد رکھّا۔ اُس وقت سے سلطنتِ مُغلیہ کے اخیر عہد تک یہ اکبرآباد کے نام سے موسوم رہا۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ آگرے کی آبادی اور رونق کو زوال شروع ہُوا۔ جاٹوں اور مرہٹوں کے زمانے میں یہاں کی آبادی اور نفیس و نایاب عمارتوں کو سخت نقصان پہنچا۔ بیسیوں عالی شان عمارتیں خزانے کی تلاش یا بیش بہا پتھروں کے لیے کھدوا ڈالی گئیں محلّے کے محلّے ویران ہوگئے۔ ۱۸۰۳ء؁ ۱۲۱۸ھ میں انگریزوں کے قبضے میں آیا۔ اب اس شہر کی آبادی ۱۸۵۵۳۲ ہی۔

آگرہ اپنی نفیس و بے نظیر عمارتوں کی وجہ سے تمام دُنیا میں مشہور اور سیّاحانِ عالم کا مرجع ہی۔ یہاں کی سب

سے خوبصورت اور عالی شان عمارت روضۂ ممتاز محل ہی
جو عام طور سے تاج یا تاج گنج کے نام سے مشہور اور
عجائباتِ دُنیا میں شمار ہوتی ہی۔ اِسے شاہجہاں بادشاہ
نے اپنی پیاری بیگم ارجمند بانو بیگم یعنی مُمتاز محل کی یادگار
میں بنوایا تھا۔ اس میں ممتاز محل اور شاہجہاں دونوں
مدفون ہیں۔ آگرے کا قلعہ اکبر بادشاہ کا تعمیر کردہ ہی جس
کے اندر اب زیادہ تر عمارتیں شاہجہاں کی بنوائی ہوئی
ہیں۔ اِن میں دیوانِ خاص، دیوانِ عام، محل خاص، شیش
محل، انگوری باغ، زنانی مسجد، نگینہ مسجد، مُثمن بُرج اور
مُوتی مسجد نہایت خوبصورت عالی شان اور قابلِ قدر
عمارتیں ہیں۔ اکبر بادشاہ کا عالی شان مقبرہ شہر سے پانچ
میل کے فاصلے پر موضع سِکندرہ بہشت آباد میں واقع اور
جہانگیر کا بنوایا ہُوا ہی اور عام طور سے سکندرہ کے نام
سے مشہور ہی۔

جمنا کے مشرقی کنارے پر نواب اعتمادالدولہ و مرزا
غیاث بیگ وزیرِ جہانگیر بادشاہ کا مقبرہ قابلِ دید ہی جِسے
اُن کی بیٹی نور جہاں بیگم نے بنوایا تھا۔ اسی کے قریب
علامی افضل خاں وزیر شاہجہاں بادشاہ کا کاشی کار مقبرہ ہی
جو چینی کا روضہ کہلاتا ہی۔ اس سے کچھ فاصلے پر نور جہاں بیگم



کی یادگار باغ نورافشاں کی عمارت ہی جو اب رام باغ کے نام سے مشہور ہی۔

شہر کی عالی شان جامع مسجد شہزادی جہان آرا بیگم بنتِ شاہجہاں کی عالی ہمتی اور دین داری کی بہترین یادگار ہی۔ آثارِ قدیمہ کے لحاظ سے شہر اور اُس کے نواح میں اور بہت سی عمارتیں موجود ہیں۔

آگرے سے تیئیس ۲۳ میل کے فاصلے پر قصبہ فتح پور سیکری واقع ہی جسے برسوں شہنشاہ اکبر کے دارالخلافت ہونے کا فخر حاصل رہ چکا ہی۔ اس میں عہدِ اکبری کی بہت سی عمارتیں قابلِ دید ہیں جن میں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی وسیع و عالی شان درگاہ، محل خاص، رنگ محل، محلِ جودھا بائی، پنچ محلہ، دیوانِ عام، دیوانِ خاص، بیربل کا مکان اور حکیموں کے محل خاص طور سے مشہور ہیں۔

آگرے سے دو میل کے فاصلے پر رادھا سوامی مت کی ایک نو آبادی قایم ہوئی ہی جو دیال باغ کے نام سے مشہور ہی۔ اس میں متعدد صنعت و حرفت کے کارخانے، کالج، اسکول، بینک، شفاخانے اور دیگر عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔

آگرے میں گوٹا، ٹھپا، نیچہ، زردوزی، دری، قالین اور پارچہ بافی اور سنگ تراشی کی صنعتیں قدیم زمانے سے چلی

آتی ہیں۔ اب پارچہ بافی کی صنعت کا تو خاتمہ ہو چکا ہی اُس کی جگہ جوتوں کی صنعت زور پر ہی۔ شہر کے ہر گلی کوچے میں جوتوں ہی کے کارخانے جاری ہیں اور نہایت اعلیٰ درجے کے جوتے تیار ہوتے ہیں۔

آگرہ صوبۂ متحدہ میں تعلیم کا خاص مرکز ہی۔ یہاں دو کالج، دو اِنٹر میڈیٹ کالج، نو ہائی اِسکول اور متعدد مڈل اِسکول اور نارمل اِسکول، میڈیکل اِسکول، ٹریننگ کالج موجود ہیں۔ اب آگرہ یونیورسٹی بھی قائم ہوگئی ہی۔

سوالات

۱۔ معنے بتاؤ:۔

جم پرست، وجہ تسمیہ، علّامی، نوآبادی، خانقاہ، خشتی، ہفت اقلیم، روضہ، مُسمّن، کاشی کار، لطافت، دارالخلافت، سیّاح

۲۔ مطلب بتاؤ:۔

(ا) سکندر لودھی نے اس مقام کو راجپوتانے کا دروازہ سمجھ کر اپنے دارالسلطنت کے واسطے پسند فرمایا۔

(ب) بادشاہ کی علم دوستی اور کمال پروری سے چند ہی روز میں آگرہ اسلامی علوم و فنون کا مرکز اور اہل کمال کا مرجع

ہوگیا۔

(ج) نقاشان نادرہ کار اور مصوران نظر فریب نے ان عمارات

میں طرح طرح کے کارنامے بنائے ہیں۔

۳۔ سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں آگرے کی کیا حالت تھی

اور بابر نے اس کی رونق میں کس طرح اِضافہ کیا؟

۴۔ "اکبر کے زمانے میں آگرے کی آبادی اور شہرت ایک سے

ہزار ہوگئی"۔ ابوالفضل کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے بتاؤ کہ

یہ بیان کس حد تک صحیح ہے۔

۵۔ جہانگیر کے زمانے میں آگرے میں کن چیزوں کا اضافہ ہوا۔

۶۔ آگرے کا نام اکبرآباد کس نے رکھا اور کیوں؟

۷۔ آگرے کے زوال کے کیا اسباب تھے یہاں کی قدیم و جدید

صنعتوں کے نام لو۔

۸۔ غزنوی، غلام، خلجی، تغلق، سیّد، لودھی، سوُر اور مُغل خاندان

کے مشہور بادشاہوں کے نام لو۔

۹۔ شیخ سلیم چشتی، جاٹ اور مرہٹوں کے بارے میں تم کیا

جانتے ہو؟

۱۰۔ بغداد اور شیراز کیوں مشہور ہیں۔ یہ دونوں اور کابل

کہاں واقع ہیں۔

۱۱۔ ان جملوں کی تحلیل صرفی کرو:۔

"شاہ جہاں کے زمانے میں آگرے کی آبادی اور رونق کمال کے درجے پر پہنچ گئی"۔

آگرے سے "تیئیس" میل کے فاصلے پر قصبہ فتح پور سیکری واقع ہی. جسے برسوں شہنشاہ اکبر کے دارالخلافت ہونے کا فخر حاصل رہ چکا ہی۔
